مکان بنانا

میرے دوست 'و' نے کہیں لکھا ہے مکان مثل درخت کی جڑ کے ہے کہ جب انسان مکان بناتا ہے تو وہ دھرتی سے رشتۂ ازدواج قائم کرتا ہے' میں نے یہ جملہ جب پہلی بار پڑھا تو مجھے احساس ہوا کہ اس جملہ میں بین السطور میرے رشتۂ ازدواج کا ذکر موجود ہے لیکن ایک عرصہ تک اس کا گہرا مفہوم میری نظروں سے پوشیدہ رہا۔ پھر یوں ہوا' ایک دن عالم اضطراب میں میں نے مکان کی نیو رکھ دی' مزدور بنیاد کھودتے رہے اور میں ان کے ساتھ ساتھ بنیاد کی گہرائی میں چلتا رہا' بنیاد جوں جوں گہری ہوتی گئی مجھے گہرائی کا عرفان ہوتا گیا۔ اس سے پہلے میں نے زمین کو کبھی اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ میرا گہرائی کا تصور ایک غیر ارضی ' مجرد خیال تھا ' جس کا ذائقہ میں نے اپنے رگ و پے میں محسوس نہیں کیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ زمین کا سارا وجود اس کی خارجی سطح پر اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ موجود ہے ' لیکن زمین کے پیٹ میں اترنے سے مجھے ایسا لگا جیسے زمین کے اندر ایک جہان نو آباد ہے۔ فضائے بسیط کی طرح اسکی بھی اپنی ایک فضا ہے ' جو تہہ در تہہ پھیلتی چلی جاتی ہے۔ بقول اقبال ' زمین اور بھی آسماں اور بھی ہیں' زمین کے اندر کا سلف اس کے باہر کے سلف سے بالکل مختلف ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے آپ کا داخلی سلف ' خارجی سلف کی ضد ہے۔ شاید اسی لئے طبقات الارض کے ماہرین جب زمین کی گہرائی سے باہر آتے ہیں تو وہ کھوئے کھوئے نظر آتے ہیں۔ اس کی غالباً" وجہ یہ بھی ہے کہ جب وہ ایک ہی زمین کے دو متضاد رخ دیکھتے ہیں تو انہیں تعجب ہوتا ہے کہ اس کا اندر تو اس

Scanned with CamScanner

سمندر کی طرح ہے جس کی تہہ ناپید ہے۔ اس کا باہر اس ایماندار آدمی کی طرح ہے جس کی ساری ایمانداری اس کے چہرے پر لکھی ہوتی ہے۔ جب آدمی زمین کے بطن میں اترتا ہے تو وہ اپنے اندر کی پراسرار معنویت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ زمین کے باہر تو ایک ایسی سطحیت ہے جس پر چلنے سے انسان اپنے اصلی وجود سے کٹ کر زمانی تناظر میں ایک ایسا حقیر تنکا بن جاتا ہے جو انبوہ کے سیلاب میں بے یار و مددگار بہتا چلا جا رہا ہو۔ زمین کی خارجی سطح پر وقت اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ یلغار کرتا ہوا گزر رہا ہے۔ وہ چہروں اور شناختوں کو تاخت و تا راج کرتا جا رہا ہے۔ لیکن زمین کے اندر تو محض Space ہے جہاں وقت کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اصحاب کہف زمین کے پیٹ سے باہر آئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ کئی صدیاں بے چاپ گزر گئی ہیں اور انہیں اس کا علم تک نہیں ہوا۔ علم بھی کیسے ہوتا؟ یہ تمام بے نام صدیاں زمین کی خارجی سطح پر گزری تھیں، اندر تو وقت ایک نقطہ پر رکا کھڑا تھا۔

زمین کے باہر صرف زمین ہی نہیں بلکہ انسانی تمدن کے سارے بدنما نقش بھی موجود ہیں اونچے اونچے مکان، سکائی سکریپرز۔ دھواں اگلتی ہوئی چمنیاں، بدوضع سڑکیں جو شیریانوں کی طرح بکھری پڑی ہیں۔ وہ ہر مسافر کو اپنے جال میں گرفتار کر لیتی ہیں اور جب وہ اس زندان سے باہر آتا ہے تو وہ وہ فرد نہیں ہوتا جو سفر کے آغاز میں تھا۔ سفر کے آغاز میں وہ افلاطون کے سماوی انسان کا ایک لطیف سا عکس تھا جو خیر و برکت کی علامت بن کر عالم وجود میں آیا تھا۔ وہ حقیقت نہیں تھا بلکہ اس حقیقتِ کلی کی پرچھائیں، جو مرکزی لائٹ کی طرح اسی کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ لیکن جب وہ بنیاد کی گہرائی سے نکل کر ٹھوس اور سپاٹ حقیقت کی گرد آلود سڑک پر روانہ ہوا تو یہ پرچھائیں غائب ہو گئی، اور اس کے ارد گرد غروبِ آفتاب سے پہلے کا جھٹپٹا پھیل گیا۔ اس نیم تاریکی کے عالم میں اس نے اپنے قرب و جوار میں اپنی طرح کے انسان کو کیڑوں کی طرح کلبلاتے دیکھا، ایسا لگتا تھا جیسے ہر کیڑا کسی غیر معلوم جبریت کے تحت

Scanned with CamScanner

دوسرے کیڑے کی شہ رگ سے لپٹا ہوا تھا۔ اس جبریت میں کوئی استدلال ' کوئی منطقی معقولیت نہیں تھی ' بلکہ یہ تو محض زندہ رہنے کی خواہش کا ایک اعلامیہ تھی ۔ بالکل ایسا ہی سفاک جذبہ جو ڈوبتے ہوئے جہاز کے آخری تختہ پر دو ملاحوں کے درمیان زندگی اور موت کی پیکار میں ظاہر ہوتا ہے۔

میں جب بنیاد میں چل رہا تھا تو مجھے یوں لگا ' جیسے میں حیاتیاتی محور پر دو واضح اکائیوں میں بٹا ہوا ہوں ' میرا نچلا حصہ زمین کے ساتھ پیوستہ ہے ۔ اس زمین کی ساری آلائشوں کے ساتھ ارضیت کا جوہر بھی شامل ہے ۔ یہی وہ حصہ ہے جو مجھے نیچے کھینچتا ہے تاکہ میری جڑیں زمین کے سینے میں پیوستہ رہ کر اپنی زندگی حاصل کرتی رہیں ۔ میرا اوپر والا حصہ ایک موٹر ڈرائیور کی طرح سٹیرنگ ویل پر بیٹھا مجھے ہدایت دیتا رہتا ہے ۔ کبھی مجھے دائیں مڑنے کا مشورہ دیتا ہے کیونکہ بقول اس کے یہ نیکی اور سلامتی کا راستہ ہے ۔ کبھی جب میرے اندر کی سلگتی ہوئی خواہشوں کا سرکش لاوہ بغاوت پر آمادہ ہوجاتا ہے تو وہ مجھے سمجھاتا ہے کہ بائیں جانب سے ہٹ کر ہی چلنے میں سلامتی ہے کیونکہ اس راستہ میں بابل اور نینوا کے شہر آتے ہیں ' جو اپنی سرکشی کی وجہ سے زیر زمین چلے گئے تھے " لیکن زیر زمین بھی تو ایک دنیا آباد ہے ۔ جس میں سنگ یشب اور مروارید کے مکانات بنے ہوئے ہیں ۔ ان میں ایسے ایسے بلوریں اجسام محوِ خواب ہیں جو تاریکی میں لودے رہے ہیں " ۔ موٹر ڈرائیور میرے زیریں حصے کے اس استدلال کو سن کر کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے اور سٹیرنگ ویل دائیں طرف موڑ دیتا ہے ۔ میں پھر مزدوروں کے ساتھ بنیاد میں ناک کی سیدھ میں چلنا شروع کردیتا ہوں ۔ کیونکہ راہِ راست کی طرح سیدھی بنیاد بھی مکان کی بنیادی ضرورت ہے۔

پھر ایک دن جب میں اپنے مکان کی بنیادوں کو دیکھنے آیا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ زمین کے سینے سے اینٹوں کے اہرام نکلے ہوئے ہیں اور زمین کے سارے گھاؤ بھر گئے ہیں مجھے خوشی بھی ہوئی کہ زمین کو جو زخم لگے تھے ' وہ اب مندمل ہو چکے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی چھوٹی چھوٹی دیواروں کو دیکھ کر

Scanned with CamScanner

اپنی مکانیت کا دکھ ہوا۔ اس سے پہلے میں ایک ایسا آزاد پرندہ تھا جو صرف شام کے وقت اپنے گھونسلے کو لوٹتا تھا۔ یہ گھونسلہ بھی محض ایک عارضی حصارِ عافیت تھا۔ اس سے میری وابستگی بس اتنی تھی جتنی کہ پرندے کی اپنے گھونسلے سے ہوتی ہے۔ لیکن اب میں ایک مرکز کے ساتھ ایک غیر مرئی سی رسی کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ ان دیواروں کی اٹھان سے پہلے میری خوشی کا محور وہ فضائے بیکراں تھی جسکی کوئی حد نہیں۔ میں دن بھر ہوا کے دوش پر نا موجود کی تلاش میں محو پرواز رہتا۔ جب 'و' کے پاس سے اٹھتا تو 'م' کے پاس جا بیٹھتا۔ جب وہاں سے اٹھتا تو کسی اور کے پاس جا بیٹھتا۔ جب دوستوں کے قہقہوں سے چائے اور سگریٹ کی خوشبو معدوم ہو جاتی تو میں ایک نا معلوم منزل کی طرف روانہ ہو جاتا۔ مجھے حاتم طائی کی طرح ہر روز ایک نیا سفر در پیش تھا لیکن اب تو میں اپنی قید کیلئے ایک سنگین قلعہ تعمیر کر رہا تھا جس میں اندر جانے کے تو کئی راستے تھے لیکن باہر آنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا جس پر میرا بڑھاپا واچ ڈاگ کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔

اب دیواریں مکمل ہو چکی تھیں۔ چھت کیلئے سریا باندھا جا رہا تھا شٹرنگ کی صلیب کھڑی کر دی گئی تھی۔ مجھے عجیب سا خوف محسوس ہوا۔ ایسا لگا جیسے کچھ دیر کے بعد میری ٹانگیں اور بازو سریا کے ساتھ باندھ دیئے جائیں گے 'اور پھر میری بیوی خندہِ زیرلب سے میرا سواگت کرے گی " اب بتاؤ تم بھاگ کر کہاں جاؤ گے ؟ تم نے اپنا زنداں تعمیر کر لیا ہے۔ تم اس میں زندگی بھر قید رہو گے " اس خیال سے مجھے پریشانی ہونے لگی۔ میں نے معماروں اور مزدوروں کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا لیکن ان کی آنکھوں میں رحم یا شرافت کا ہلکا سا رنگ بھی نہیں تھا۔ وہ میرے وجود کی تمام تر خواہشوں سے بے نیاز ہو کر میری جیب تلاش کر رہے تھے جو اب سکڑ کر میرے پیٹ سے لگ گئی تھی۔ دراصل ان کی ساری دلچسپی میری قید سے تھی نہ کہ میری رہائی سے ' وہ آہستہ آہستہ میرے وجود کو گارے ' سیمنٹ اور ریت میں چنتے جا رہے تھے اور اس دن

کے انتظار میں تھے جب میں اپنے ہی تعمیر کردہ مکان میں سرتا پا دب جاؤں گا۔ اور وہ اس پر میرا کتبہ۔" ھذا من فضل ربی" لکھ کر میرے گھر سے رخصت ہو جائیں گے۔

مکان بالکل زمانہ حال کی ایجاد ہے۔ ابتداء میں کوئی مکان نہیں تھا اس لئے زمان و مکان کا تصور بھی نہیں تھا۔ ہماری زمین اپنے کنوار پن کی سوندھی خوشبو میں سرمست گھوم رہی تھی۔ وہ اپنے مرکز سے کٹ چکی تھی۔ بالکل پنجابی فلم کی اس الھڑ مٹیار کی طرح جو ناچتے ناچتے گھر سے اتنا دور نکل گئی ہو کہ اب واپس جانا اس کے بس کی بات نہ ہو۔ پھر یوں ہوا کہ اس مست خرامی کے کسی نایاب لمحہ میں زمین کی کوکھ زندگی سے بھر گئی اور جب یہ زندگی ظاہر ہوئی تو اس میں زمان و مکان کا نادیدہ عنصر بھی شامل ہو گیا۔ بد قسمتی سے اس عنصر میں خرابی کی صورت بھی مضمر تھی۔ جب تک مکان کا مرئی وجود نہیں تھا تو فساد کی کوئی معقول وجہ بھی موجود نہیں تھی، لیکن جوں ہی مکان کی تعمیر کا خواب عمل کی دنیا میں داخل ہوا تو سب سے پہلے ہمسائیوں سے نالی کے رخ پر جھگڑا ہوا۔ اس جھگڑے میں نالی کے ساتھ ہمسائیوں کی جوان بہو بیٹیوں کا پردہ بھی فریقِ ثانی کی حیثیت سے شامل ہو گیا۔ جب یہ جھگڑا ختم ہوا تو ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن سے اقساط کی بے قاعدہ آدائیگی پہ مقدمہ بازی شروع ہو گئی، اس جنگ میں وکلا، رفقا، عزیز و اقارب اور ان کے اعزا سب شامل ہو گئے۔ مقدمہ ختم ہونے سے پہلے ہی باپ بیٹوں میں تقسیم اراضی اور حق وراثت پر لے دے کا آغاز ہوا۔ چنانچہ وہی باپ جس نے اپنے وجود کی نفی کر کے مکان کی پیشانی پر "علم دین ولا" لکھا تھا اب اپنے بیٹے علم دین کو نافرمانی اور مشکوک کردار کی بنا پر تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے محروم کر رہا تھا۔ سجدہ نہ کرنے پر شیطان کا یہی تو موقف تھا کہ آدم زمین میں فساد برپا کرے گا۔ اسے معلوم تھا کہ باغ عدن سے نکلنے کے بعد آدم کو لا محالہ مکان کی ضرورت پیش آئے گی اور اس کا نتیجہ وہی ہو گا جو چیزوں کو حاصل کرنے کی خواہش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مجھے نادانستہ طور پر

Scanned with CamScanner

شیطان سے ہمدری پیدا ہو گئی۔" اس میں ہزار خرابیاں سہی، لیکن اس کی سوجھ بوجھ اور دانائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا"۔ میں نے جب مستری سے شیطان کی ذہانت کا تذکرہ کیا تو پہلے اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ پھر دو تین اینٹیں توڑ کر نیچے پھینکیں اور مزدور کو آواز دی کہ وہ تیار شدہ مسالہ میں ریت ملا دے اب کام کل صبح ہی شروع ہو سکے گا۔ یہ سن کر مجھے اپنی حماقت پر افسوس ہوا۔

مکان بنانا چنداں مشکل نہیں یہ کام تو دنیا کا چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی کر سکتا ہے، بلکہ میری دانست میں چھوٹا آدمی بہتر کر سکتا ہے۔ اصل مسئلہ تو مناسب جگہ کا انتخاب ہے، بعض لوگ جب کبھی مکان کی تعمیر کا منصوبہ بناتے ہیں تو اس میں اولیت اینٹ، سیمنٹ گارے کو دیتے ہیں اور جگہ کو دلال کی صواب دید پر چھوڑ دیتے ہیں۔ دلال عام طور پر ایسے خطہ زمین کو ترجیح دیتے ہیں جو نشیبی علاقے میں ہو تاکہ آپ کو پانی کی تکلیف نہ ہو اور کیچڑ اور گندگی میں آپ خود کفیل ہو جائیں۔ اس کے بر عکس فن کار اور شاعر حضرات مکان سے زیادہ مکان کے حدود اربعہ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لیے میں نے اکثر شعرا کو حدود اربعہ سے آگے جاتے نہیں دیکھا، مثلاً" غالب کو ہی لیجیے، وہ عمر بھر کرایہ کے مکان میں رہا (اور مکان بھی ایسا جہاں کوئی معقول آدمی نہیں رہ سکتا) وہ مغل زادہ تھا۔ روزانہ بکری کے کباب کھاتا اور بادام کا حریرہ پیتا، تھوڑی سی ولایتی شراب بھی شعری ضرورت سمجھتا تھا۔ چنانچہ ان وسائل کا آدمی کسی وقت بھی تین بیڈ کا مکان بنا سکتا تھا۔ لیکن غالب کی مشکل یہ تھی کہ مکان عرش سے پرے ہونا چاہیے تاکہ وہاں سے مزید بلندی پر جایا جا سکے۔ غالب کے زمانے میں عرش سے پرے جگہ کی تو کوئی کمی نہیں تھی لیکن وہاں تک تعمیراتی سامان لے جانے کا بندوبست نہیں تھا۔ پھر غالب کا یہ بھی اصرار تھا کہ جگہ ایسی ہونی چاہیے جہاں کوئی ادیب یا غیر ادیب پڑوس میں نہ رہتا ہو بلکہ

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

Scanned with CamScanner

مکان کے لئے ایسی سائیٹ یوں تو آئیڈیل ہے ' لیکن اس کی دقت وہی ہے جس کا ذکر 'و' نے کیا ہے ' یعنی دھرتی سے رشتہ ازدواج اگر آدمی فضا میں مکان بنائے تو وہ زمین سے ناطہ کیسے قائم رکھ سکتا ہے اور زمین پر بنائے تو اہل زمین کے شر سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے ؟ بالخصوص مستری اور مزدور کے شر سے ---- اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب میرا مکان بالکل تیار ہو جائے گا تو میں اس کے سائے میں بیٹھ کر اپنے رشتہ ازدواج پر غور کروں گا اور سوچوں گا کہ کیا دھرتی یعنی مکان سے وابستہ رہنا بہتر ہے ' یا مکان کی "مکانیت" سے نکل کر غیر محدود فضا میں چہل قدمی کرنا ؟

Scanned with CamScanner

بچہ پالنا

بچہ پالنا چنداں مشکل نہیں۔ شرط صرف اتنی ہے کہ بچے میں پلنے کی صلاحیت موجود ہونی چاہیے ۔ کچھ بچے انتہائی غیر معقول ہوتے ہیں ۔ وہ ابتدا ہی میں عدم تعاون کی پالیسی پر کاربند ہو جاتے ہیں۔ آپ بزرگانہ تعاون کو جتنا آگے بڑھاتے ہیں ' وہ اتنا ہی پیچھے ہٹتے جاتے ہیں۔ اس معاندانہ رویہ کو سیاست کی زبان میں رجعت قہقری کہتے ہیں ۔ ایسی رجعت یوں تو بوڑھوں میں بھی پائی جاتی ہے لیکن اس کا انداز داخلی اور مزاج صوفیانہ ہوتا ہے۔ مثلاً جب بوڑھا زندگی کی شورش یا بال بچوں کی یورش سے گھبرا جاتا ہے تو وہ اپنے اندر سکڑتا ہے' وہ باہر کے شعوری سلف کو اپنے اندر کے غیر شعوری سلف میں چھپا لیتا ہے 'تاکہ وقت کی دستبرد اور ہم چشموں کی لگاوٹ سے محفوظ ہو جائے ۔ لیکن بچہ فطرتاً" نمائش پسند ہوتا ہے ۔ وہ اپنے رویہ سے اپنے سلف کی نفی نہیں کرتا بلکہ اسے بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے اور آپ سے مکمل وفاداری بلکہ تابعداری طلب کرتا ہے۔ ادھر آپ نے اپنی چشم محبت میں ذرا سی زہر آلودگی کا مظاہرہ کیا 'ادھر اس کی فضا یکسر مکدر ہو گئی اور احتجاجاً" اس نے اپنی آمریت کا اس زور شور سے اظہار کیا کہ محلے والوں اور والیوں نے آپ کے دروازے پر ہلہ بول دیا"۔ خیر تو ہے ۔ آپ منے کو کیوں مار رہے ہیں ۔ آپ کو شرم نہیں آتی ""؟ اگر خدا نخواستہ آپ بچے کے باپ نہیں ' بلکہ دادا نانا قسم کی غیر پسندیدہ مخلوق ہیں ' تو آپ پر ہر قسم کے الزام واتہام لگائے جائیں گے ۔ مثلاً بوڑھا سٹھیا گیا ہے ۔ آدم خور ہے ۔ بچہ بیزار ہے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ 'اگر حسن اتفاق سے ان صاحبان یا صاحبات میں

Scanned with CamScanner

سے کسی کو نفسیات سے معمولی سی بھی دلچسپی یا آگاہی ہوئی تو وہ لوگوں کو بڑے د ثوق سے بتائیں گے کہ آپ اپنے اندر کے نا آسودہ بچے سے منتقمانہ سلوک کر رہے ہیں ۔ آپ کسی شدید نفسیاتی کمپلکس (Complex) کا شکار ہیں ۔ آپ لوگوں کی اس سرزنش سے کبیدہ خاطر تو ضرور ہوں گے لیکن بچے سے آپ دست کش نہیں ہو سکتے ۔ کیونکہ اس طرح تو آپ محلے بھر میں بدنام ہو جائیں گے اور آئندہ کوئی بچہ آپ کے قرب و جوار میں بھی نہیں پھٹکے گا ۔ یوں آپ بچے سے تو بچ جائیں گے لیکن آپ کی چنگیزیت اور مردم بیزاری مسلّم ہو جائے گی ۔

بچے کا آپ کے پاس نہ آنا ' یا احتجاجاً" آپ سے پرہیز کرنا ۔ کوئی ایسی بُری بات نہیں ۔ بلکہ المیہ یہ ہے کہ وہی معصوم بچہ جسے آپ بے ضرر سمجھتے تھے اجتمائی ستیہ گرہ کی علامت بن جاتا ہے ۔ اس کے ماں باپ ' ماموں ' ممانی ' خالہ خالو ' غرضیکہ تمام جو فروش گندم نما قسم کے رشتہ دار فوراً" آپ سے گریز کرنے لگتے ہیں اور جو کوئی جس شخص سے بھی ملتا ہے آپ کے خلاف زہر پھیلاتا چلا جاتا ہے ' اس طرح آپ کے خلاف سرگوشی کی ایک مہم شروع ہو جاتی ہے 'اور آپ شہر بھر میں بچہ دشمنی ' سادیت ' بربریت ' قنوطیت کا ایک واضح سمبل بن جاتے ہیں ۔ اگر بد قسمتی سے آپ چھوٹے موٹے شاعر بھی ہیں تو آپ کے کلام میں ایسے عناصر کی نشاندہی کی جاتی ہے جن میں معاشرہ کی اعلیٰ اقدار سے بغاوت کی بو آتی ہے ۔ ہوتے ہوتے معاملہ یہاں تک پہنچتا ہے کہ سرمایہ دار آپ کو اشتمالی اور اشتمالی آپ کو سرمایہ دار کہہ کر گردن زدنی ' کشتنی بلکہ سوختنی سمجھتے ہیں ۔ اب آپ کا یہ عالم ہے کہ آپ سب سے چھپتے پھرتے ہیں اور بچہ اپنے پالنے میں آپ کی بزرگی اور بزدلی پر قہقہے لگا رہا ہے ۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ بچے کا پالنا چنداں مشکل کام نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ بچہ مستقل مزاج اور دیدہ زیب ہو اور آپ سے پورا پورا تعاون کرے ۔ بچے عام طور پر دو قسم کے ہوتے ہیں (حالانکہ ان کی مائیں کئی قسم کی ہوتی ہیں) یعنی دیدہ زیب اور معقول حد تک دیدہ فریب ۔ میں نے آج تک کوئی ایسا بچہ

Scanned with CamScanner

نہیں دیکھا جو اپنے ماں باپ سے زیادہ بد صورت ہو (وہ جو فرشتہ صورت بچوں کا تذکرہ ملتا ہے در اصل انجمن اطفال کا پھیلایا ہوا ریکٹ ہے) خیر جہاں تک شکل و صورت یا مجموعی ہیئت کذائی کا تعلق ہے ہر بچہ گوارا ہوتا ہے' بشرطیکہ اس کا رویہ شریفانہ اور صحت مندانہ ہو ۔ اچھے بچے اپنے پالنے والے کے اس حد تک تو ضرور ممنون ہوتے ہیں کہ اگر انہیں دودھ پلانے یا سلانے جگانے میں ذرا تاخیر بھی ہو جائے تو وہ صرف نظر سے کام لیتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ منہ لٹکا لیتے ہیں ۔ یوں بھی بچپن میں چہرہ اتنا سیال ہوتا ہے کہ اسے دیکھ کر بچے کے موڈ کا تعین کرنا انتہائی مشکل کام ہوتا ہے ۔ بہر کیف اگر اچھے بچوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ انہی کے نان و نفقہ میں مصروف ہیں تو وہ ایک حد تک آپ سے تعاون کرتے ہیں ۔ میری ایک پوتی اسی شریفانہ کیٹیگری سے تعلق رکھتی ہے ۔ میں ان دنوں اپنی فرصت کے اوقات کا بیشتر حصہ اسے کھلانے پلانے 'یا شعر سنانے میں صرف کرتا ہوں ۔ چنانچہ جب میں شعری الہام کا ورد کرنے بیٹھتا ہوں تو وہ خاموشی سے میری گود میں سو جاتی ہے' مجھے اس وقت اسکی نیند کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے جب میری گود سیراب ہو جاتی ہے اور ایک غیر معمولی سیال قسم کی گرمی کا احساس ہوتا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں شاید یہ شعر کی گرمی اور توانائی کا اثر ہے' لیکن سچ تو یہ ہے کہ چھوٹے بچے چھوٹے ہی ہوتے ہیں اور ان کا ذوقِ شعر انتہائی کچا ہوتا ہے ۔ مجھے اس قسم کی داد سخن سے ذرا بھر بھی کوفت نہیں ہوتی کیونکہ شریف بچہ یا بوڑھا اگر کبھی معمولی سی غلطی، یا حماقت کر بیٹھے تو معقول لوگ اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ غلطی سے چشم پوشی' صلح جوئی اور عفو و درگذر کا رویہ موجودہ دور کی سب سے بڑی ضرورت ہے ۔

اگر آپ کو مجلس اقوام عالم کی کسی میٹنگ کی کاروائی پڑھنے یا سننے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس وقت عالمی بحران اور قوموں کی باہمی چپقلش کی وجہ صرف یہ ہے کہ متحارب گروہوں میں ایک دوسرے کو معاف کر دینے کی صلاحیت کم سے کم تر ہو گئی ہے ۔ حالانکہ دونوں گروہ اس امر

کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ انسان غلطی کا پتلا ہے ۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی غلطی سے صرفِ نظر کرنے کے لئے تیار نہیں ۔ غالبا اس کی وجہ یہ ہے کہ متحارب گروہوں کے قائدین کو بچہ پالنے کا تخلیقی تجربہ نہیں ہوا جب آدمی بچہ پالتا ہے تو اس کی دلچسپی تعمیری ہوتی ہے ۔ وہ ہر قسم کی تخریب سے کنارہ کش ہو جاتا ہے ۔ وہ بڑی سے بڑی غلطی معاف کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ دراصل بچہ اس کے لئے ایک نئے دور کا عہد نامہ ہوتا ہے ۔وہ اس کے خدو خال میں آنے والے اس سنہری زمانہ کے نقش دیکھ رہا ہوتا ہے ۔ جب معصومیت ' خیر و برکت اور محبت و آشتی کا دور دورہ ہو گا ۔ بچہ محض گوشت پوست کا ایک خوشنما پیکر ہی نہیں بلکہ وہ تو ایک ایسا یو ٹوپیا ہے جس کی ہم صدیوں سے تلاش کر رہے ہیں ۔ وہ ہمارے بے نام خوابوں کی ایک خوبصورت تجسیم ہے ۔ بچہ تو ایک تجریدیت ہے' جسے گرفت میں لینے کے لئے اسے ناک سے سونگھنا ' کان سے سننا اور پورے جسم سے محسوس کرنا ضروری ہے ۔ بچہ دو غیر متوازی سمتوں کا مقام اتصال ہے جہاں آنے والے اور گذرے ہوئے زمانے آکر ملتے ہیں۔

بچہ جیسا میرے دوست ' و ' نے کہا ہے ایک مکمل سوشلسٹ ہے وہ خود مال و دولت ' سیم و زر' ہر قسم کی مزروعہ اور غیر مزروعہ اراضی سے آزاد ہوتا ہے لیکن اس تہی دستی کے باوجود دنیا کی ہر چیز کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتا ہے ۔وہ خود کچھ بھی نہیں کماتا لیکن سب سے پہلے اور سب سے اچھا کھانا طلب کرتا ہے ۔ نہ وہ کپاس اگاتا ہے اور نہ ہی ٹیکسٹائل مل چلاتا ہے۔ لیکن عمدہ سے عمدہ لباس طلب کرتا ہے ۔ اس میں دودھ دینے کی چنداں صلاحیت نہیں ہوتی 'لیکن دن بھر دودھ پیتا ہے چنانچہ مارکس جس جنت ارضی کی تلاش میں ہے ' وہ دراصل انسانی معاشرے میں بچپنے کو دریافت کرنا ہے۔ اور جس سیاستدان کو اپنے بچپن کے سوا کسی اور بچے کو پروان چڑھانے کا تجربہ ہی نہیں ' وہ کیسے جان سکتا ہے کہ بچے کا پالنا کتنا بڑا تخلیقی تجربہ ہے۔ غالبا یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بیشتر

Scanned with CamScanner

سیاستدان خطِ استوا اور خطِ جدی کی تقسیم پہ لڑتے رہتے ہیں ۔ ان کی تگ و دو اور جارحانہ سرگرمیوں کا سارا ماحصل یہی ہے کہ دنیا میں بچہ رہے اور نہ بچہ پالنے والا ۔ بچہ پالنے سے گریز کرنا در اصل انسانی تہذیب اور امن و آشتی کو تباہ کرنے کی خواہش کا اظہار ہے۔ جو آدمی خلوصِ نیت سے بچہ پالتا ہے وہ ایک ایسی معصوم دنیا کا خواب پال رہا ہوتا ہے جس میں خود فراموشی اور بے غرض محبت' خود پرستی اور غرض مندی کی جگہ لے لیتی ہے ۔ میرا یقین ہے کہ اگر ہٹلر کا بچہ ہوتا یا وہ محض تفریح طبع کی خاطر گوبلز کا بچہ پال لیتا تو دنیا دوسری جنگ کی ہولناک تباہی سے بچ گئی ہوتی ۔ اب بھی اس امر کی ضرورت ہے کہ دنیا کے جنگ پسند سیاستدان فوراً" بچے پالنا شروع کردیں ۔ تیسری عالمی جنگ کو روکنے کے لئے اس سے بہتر' سادہ اور ارزاں اور کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی ۔

بچہ پالنا چنداں مشکل کام نہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ آپ نے اس بے ضرر جملہ سے یہ تاثر لیا ہو کہ بچہ ایک خود کار مشین ہے اور آپ کا کام محض دور بیٹھ کر اس کے چلنے کے عمل کو دیکھنا ہے ۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ جب کبھی اس مشین میں خرابی پیدا ہو جائے تو کسی کل پرزے کو کس دیں یا ذرا سا تیل دے دیں ۔ بات اتنی آسان نہیں ۔ بچے کو پالنے کے لئے گہری وابستگی انتہائی ضروری ہے۔ اگر آپ بچے کو فاصلے سے پالنے کی کوشش کریں گے تو آپ کی ناکامی یقینی ہے ۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے آدمی تنور سے دور بیٹھا روٹیاں لگا رہا ہو ۔ بچہ پالنے کے چند بنیادی اصول ہیں جو آپ کو رہنمائے خانہ داری قسم کی کسی اچھی کتاب میں مل جائیں گے ۔ کچھ اصول ایسے بھی ہیں جو میں نے بچہ بانی (باغبانی کے وزن پر) میں طویل ریاضت کے بعد اخذ کئے ہیں۔ مثلاً" بچہ پالنے سے پہلے آپ کو اپنی بزرگی کو خیرباد کہنا ہو گا ۔ آپ کی داڑھی نہیں تو آپ کو داڑھی بڑھانا پڑے گی (برناڈ شا کی داڑھی بطور ماڈل سامنے رکھیں) اگر آپ صاف ستھرا 'بے داغ لباس پہنتے ہیں تو آپ کو بوڑوا انداز بدلنا ہو گا ۔ اگر آپ کے سر پر بال ہیں (خواتین اس قاعدہ کلیہ سے مستثنےٰ ہیں) تو انہیں منڈانا پڑے گا ' اگر

آپ کلاسیکی موسیقی سے نا آشنا ہیں تو آپ کو موسیقی کا ذوق پیدا کرنا ہو گا۔ اگر آپ کو وقت پر سونے اور جاگنے کی عادت ہے تو آپ کو ان عادات کو بدلنا ہو گا ۔ الغرض آپ کو اپنے اندر سے اس بچے کو برآمد کرنا ہوگا جو سالوں پہلے آپ کی معرفت یا لا پرواہی کی وجہ سے گم ہو گیا تھا ۔ جب آپ کے اندر کا گم شدہ بچہ باہر آجائے گا تو وہ خود بخود پلنے والے بچے کا چارج لے لے گا اور آپ یہ دیکھ کر انتہائی مسرور ہوں گے کہ پہلے ہی دن دونوں بچے ایک دوسرے سے اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ آپ کا وجود غیر ضروری ہو گیا ہے ۔ وہ تو تلی زبان میں ایک دوسرے سے ہم کلام ہیں ۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہیں ۔ جب ایک بچے کے پیٹ میں درد اٹھتا ہے تو دوسرا بچہ از خود بے تاب ہو جاتا ہے ۔ جب ایک بچہ دودھ پیتا ہے تو دوسرا غیر شعوری طور پر اپنے ہونٹ چاٹنے لگتا ہے ۔ یہ وابستگی جو پر اسرار بھی ہے اور گہری بھی ۔ زندگی میں کسی اور سے پیدا ہی نہیں ہو سکتی ۔ اس وابستگی میں کوئی ذاتی یا مالی فائدہ مد نظر نہیں ہوتا ۔ اور نہ اس میں رسمی عشق یا محبت کا کھوٹ پن شامل ہوتا ہے ۔

عشق جیسا کہ ہمارے مشرق میں رائج ہے، دراصل نرگسیت یا نمائش ذات کا اظہار ہے اور بچہ پالنا خود فراموشی یا ذات کو تج دینے کا عمل ہے ۔ اس عمل کا اس وقت آغاز ہوتا ہے ۔ جب بچہ پالنے والا مصنوعی رکھ رکھاوء اور ذاتی وقار کے سارے تقاضوں سے بلند ہو جاتا ہے اور بچے کی ذات میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے جیسے ناک کے راستے زکام ۔ عام طور پر آغاز ہی میں پلنے والا بچہ پالنے والے بچے سے برابری یا رفاقت کی سطح پر اتر آتا ہے ۔ وہ اس کی داڑھی کھینچتا ہے ۔ بال نوچتا ہے ۔ اس کے لباس پر رنگا رنگ نقش و نگار بناتا ہے ۔ اس کی ہیئت پر قہقہے لگاتا ہے ۔ لیکن پالنے والا بچہ اس حسن سلوک پر کسی خفگی یا برہمی کا اظہار نہیں کرتا بلکہ خوشی سے سرشار ہو کر ناچنے لگتا ہے ۔ اور اس اپنائیت کا دوسروں سے بڑے فخر سے ذکر کرتا ہے ۔ کیا عشق میں ذات کی ایسی نفی ممکن ہے ؟ ایمان سے بتائیں کہ اگر محبوب یا محبوبہ آپ کی داڑھی کھینچ

Scanned with CamScanner

لے یا آپ کے گنجے سر پر ٹھونگا مار دے تو آپ کا کیا رد عمل ہو گا؟

ممکن ہے آپ میرے مشاہدات سے متاثر ہو کر بچہ پالنا شروع کر دیں۔ بظاہر یہ ایک نیک اور مفید کام ہے لیکن اگر آپ نے زندگی کے کسی مرحلہ پر سکڑنے اور سمیٹنے کا ریاض نہیں کیا اور آپ کی شخصیت میں یک رخا پن ہے تو آپ بچہ پالنے سے احتراز کریں۔ اس سے بہتر ہے کہ آپ بٹیر پال لیں۔ بٹیر بچے سے اس حد تک مختلف ہوتا ہے کہ وہ دست آموز ہوتا ہے وہ آپ کے ہاتھ کی گرمی۔ سردی۔ نرمی۔ سختی کے مطابق اپنی ہیئت ترکیبی اور اپنے انداز فکر کو بدلتا رہتا ہے چنانچہ اس کی شخصیت میں بٹیر باز کی ساری شخصیت جھلکنے لگتی ہے۔ انجام کار بٹیر اور بٹیر باز کی شخصیت میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن ہر بچہ اپنی ایک جداگانہ شخصیت لے کر پیدا ہوتا ہے اور بڑی سختی سے اس تشخص کی سالمیت کو برقرار رکھتا ہے۔ جونہی آپ اس کے مزاج کے خلاف کوئی کام یا حرکت کرتے ہیں تو وہ عدم تعاون بلکہ جارحیت کی پالیسی اختیار کر لیتا ہے۔ اسے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ رات کو سونا پسند کرتے ہیں تو وہ دن بھر سوتا ہے اور رات بھر روتا ہے۔ رونا اسکی طبعی ضرورت نہیں بلکہ محض بغاوت کے جذبے کا اظہار ہے۔ اسی طرح اگر آپ چائے یا کافی پینا پسند کرتے ہیں تو وہ دودھ پر اصرار کرتا ہے' اور اگر آپ دودھ پینے کے حق میں ہیں تو وہ دودھ پینے سے انکار کر دیتا ہے۔ غرض یہ کہ وہ ایک ایسا انفرادیت پسند ہے جو آپ کے وضع کردہ ضابطہ اخلاق سے روگردانی کرتا ہے۔ اس کی بغاوت ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہوتی ہے اس لئے اگر آپ طبعاً" صلح جو ہیں اور خانگی سکون کو اخلاق حسنہ پر ترجیح دیتے ہیں تو آپ کے لئے یہی بہتر رہے گا کہ آپ بچہ نہ ہی پالیں۔ بقول اقبال

انہی کا کام ہے جن کے کہ حوصلے ہیں زیاد

غیر ذمہ داری

غیر ذمہ داری بڑی ریاضت اور ذمہ داری کا کام ہے۔ اس لئے غیر ذمہ دار افراد کی تعداد اتنی ہی کم ہے جتنی کہ اچھے صوفیا کی۔ میں نے اس ضمن میں صوفی کا ذکر دانستہ کیا ہے کیونکہ صوفی بھی جب تک ایک خاص قسم کی نجی یا کاروباری ذمہ داری سے دامن کش نہ ہو جائے وہ سلوک کے اس دائرہ میں داخل نہیں ہو سکتا جہاں صرف بے غرض لوگ ملتے ہیں۔ بے غرضی در اصل غیر ذمہ داری کا شانتی روپ ہے۔ غرض مند تو اس شکاری کتے کی طرح ہے جو ہمہ وقت اپنے خرگوش کے تعاقب میں رہتا ہے۔ اس کی ہر چال سوچی سمجھی سکیم کے تحت ہوتی ہے۔ مثلاً وہ آپ کے شعر کی اس لئے داد دیتا ہے کیوں کہ اس نے چند روز کے بعد اپنے بیٹے یا بیٹی کی مفروضہ شادی پر آپ سے قرضہ لینا ہے۔ شادی اور شادی کا احساسِ ذمہ داری اس کی بے غرضی کے راستے میں دیوارِ چین کی طرح حائل ہے لیکن بے غرض آدمی تو آپ کے شعر کی چنداں داد نہیں دے گا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ سطحی نقطہ ء نظر رکھنے والے شعراء ایسے شخص کو "غیر ذمہ دار" کے لقب سے نوازتے ہیں' حالانکہ یہ آدمی سکوت۔ سخن شناس کی ذیل میں آتا ہے۔

غیر ذمہ داری شادی بیاہ کی طرح کوئی ایسا اضطراری عمل نہیں ہے جس کے لئے کسی کاوش یا منصوبہ بندی کی ضرورت نہ پڑتی ہو۔ غیر ذمہ داری کا ایک بھرپور دن گزارنے کے لئے کئی دن سوچنا پڑتا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب لوگ زندگی کی ذمہ داری یعنی اس کے تنوع اور رنگا رنگی

Scanned with CamScanner

سے گھبرا جاتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو ملازمت ' کاروبار یا شادی کے خط مستقیم سے وابستہ کر لیتے ہیں اور پھر ساری عمر اپنے اوپر ذمہ داری کا قابوس طاری رکھتے ہیں ۔ کبھی کبھی وہ اس کے خونی پنجے سے بھاگنا چاہتے ہیں۔ لیکن ذمہ داری ہزار پا کی طرح ان کی ساری شخصیت کو اپنے پنجوں میں جکڑ لیتی ہے۔ میں نے ایسے ذمہ دار افراد کو بڑی تکلیف دہ موت مرتے دیکھا ہے۔ وہ فائنل ہچکی سے پہلے بھی انتہائی ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہیں اور بیوی کو(اگر وہ مرحوم کے لواحقین میں شامل ہو) بچوں کی مناسب نگہداشت ۔ بجلی کے بل کی بر وقت ادائیگی اور اپنی ساس سے بقائے باہمی کی بنیاد پر مستقل لڑائی کی تلقین کرتے ہوئے جام شہادت نوش کرتے ہیں ۔ مرنے کے بعد مرحوم کے دوست اکثر مرحوم کی تعریف میں صرف اتنا ہی کہتے ہیں کہ وہ انتہائی شریف' با شرع اور ذمہ دار آدمی تھا۔ اس کے آگے مرحوم کی ساری خوبیوں کی فہرست ختم ہو جاتی ہے اور رونے والے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ رونے کے لئے کون سا جواز پیدا کیا جائے ۔ میں نے یہی احساس ذمہ داری شیکسپیر کے اکثر المیہ کرداروں پر مسلط دیکھا ہے۔جب تک وہ زندہ رہتے ہیں اپنی اور اپنی بیوی کی عصمت کا نہایت ذمہ داری سے تحفظ کرتے رہتے ہیں اور مرنے سے پہلے اپنے ناظرین سے یہ تقاضے کرتے ہیں کہ انہیں انتہائی ذمہ دار فرد سمجھتے ہوئے ان کی ساری کوتاہیوں کو معاف کر دیا جائے۔ میں نے ان کرداروں کی موت کبھی حادثاتی یا فطری نہیں دیکھی بلکہ وہ اپنی موت کی ذمہ داری بھی خود ہی قبول کرتے ہیں۔ ہمارے شعراء ایسے نازک موقعوں پر بڑا خوبصورت سا بہانہ تلاش کر کے موت کی ذمہ داری کسی اور پر ڈال دیتے ہیں ۔ مثلاً ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب ۔ مجھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

دراصل ذمہ دار فرد ایک خاص قسم کی نرگسیت یا خود مرکزی کا شکار ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے خول سے باہر آنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس غیر ذمہ دار فرد ہوا کی طرح آزاد ہوتا ہے۔ وہ زندگی اور موت کی

کسی سکہ بند ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا۔ وہ جب اور جہاں چاہتا ہے پیدا ہوتا ہے اور حسبِ خواہش مرتا ہے۔ ممکن ہے آپ میرے استدلال سے اتفاق نہ کریں یہ بھی غالباً ذمہ دار افراد کی ہی ایک علامت ہے۔ وہ فکر کے صرف ان زاویوں کو مستند سمجھتے ہیں جو گھس پٹ کر قاعدہ کلیہ کی فرسودگی میں ڈھل گئے ہوں۔ ذمہ داری کسی باضابطہ دانشمندی کا نتیجہ نہیں بلکہ عادت کی جکڑ بندی کا ہے اس لئے عام طور پر ذمہ دار افراد اس حس سے عاری ہوتے ہیں جسے چھٹی یا ساتویں حس کہا جاتا ہے۔

"غیر ذمہ داری" جیسے میں نے ابھی عرض کیا ہے' انتہائی سوچ بچار' اور دانش مندانہ منصوبہ بندی کا تقاضا کرتی ہے۔ اس مثبت اور کار آمد رویہ کو اختیار کرنے سے پہلے آدمی کو تمام غیر ذمہ دارانہ افعال و اشغال کی ایک فہرست مرتب کرنا پڑتی ہے ۔ یہ فہرست تقریباً اتنی ہی جامع ہوتی ہے جتنی کہ زندگی۔ صبح بیدار ہونے سے لے کر پچھلی رات کی آوارہ گردی تک سارا پروگرام مرتب کرنا پڑتا ہے اس پروگرام کی جزئیات پر خصوصی توجہ دینا پڑتی ہے۔ اپنے ملاقاتیوں' دوستوں ' اپنے افسر اور ماتحت کی سائیکی۔ سائیکالوجی بلکہ بیالوجی پر تفصیلی غور کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ ان سے کسی کا بھی ردِ عمل غیر ذمہ داری کے سارے کردار کو بدل سکتا ہے۔ پھر زندہ رہنے کے لئے پیشے کے انتخاب میں احتیاط برتنی پڑتی ہے۔ کیوں کہ وہ پیشے جو کرسی کی سیٹ پر منجمد ہوتے ہیں ۔ غیر ذمہ دار افراد کی طبیعتوں کے عین منافی ہوتے ہیں۔ بھلا آوارہ ہوا یا سبک سیر خوشبو کو کرسی کی سیٹ پر کون بٹھا سکتا ہے؟ کرسی پر تو صرف ایسا پتھر ہی جم کر بیٹھ سکتا ہے جس کے خاندان میں کوئی جاندار چیز پیدا نہ ہوئی ہو۔ کرسی ہماری سرکاری زبان میں ذمہ داری کی ایک ایسی علامت ہے جو آہستہ آہستہ اپنے اوپر بیٹھنے والوں کا خون چوس لیتی ہے۔ اس کے ماتھے کی تیوری اور ٹھوڑی کے نیچے معلق گوشت اس احساس ذمہ داری کے خارجی مظاہر ہیں۔ آپ کو اگر کسی بڑے دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ پہلی ہی نظر میں ایسے ذمہ

Scanned with CamScanner

دار اشخاص کو پہچان لیں گے۔ انہیں مل کر آپ کو ان کے اندر کے خلاء کا احساس ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی کشش ِ ثقل سے کٹ کر پائی کرافٹ (Pyecraft) کی طرح ہوا میں معلق ہیں اور اس بالائی فضا سے نیچے آنے کے لئے انہیں کسی نہایت اہم ڈیپارٹمنٹل میٹنگ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ورنہ ہو سکتا ہے وہ کبھی کرہ ء ہوا سے نکل کر واقعات کی ٹھوس دنیا میں داخل ہی نہ ہوں۔ اس کے بر عکس غیر ذمہ دار افسر (جو غالبًا ہمارے ہاں بہت کم پائے جاتے ہیں) ایک ایسا گاتا چہکتا ہوا پرندہ ہے جو ابھی اس شاخ پر نادیدہ موسم گل کے گیت گا رہا تھا اور ابھی آپ کے ساتھ کینٹین میں چائے پی رہا ہے' بلکہ وہ اہم فیصلے بھی چائے کی میز پر ہی کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے فیصلوں میں چائے کا سیال پن اور چینی کی مٹھاس موجود ہوتی ہے۔ ایسے افسر عام طور پر ڈپلومیٹک کور میں بہت کامیاب سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے بیان میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ اس کی کئی پرتیں ہوتی ہیں اور ہر پرت دوسری سے مختلف۔ اس کے بر عکس ذمہ داری شاہراہ قائداعظم کی طرح ہے جس کی ابتدا اور انتہا ہائی وے کے ذہین افسران سے لے کر سکول کے کند ذہن بچوں تک کو معلوم ہے۔ اگر آپ ان سے اس شاہراہ کے نسب نامہ کے متعلق پوچھیں تو وہ فورا آپ کو بتا دیں گے کہ یہ سڑک پشاور سے شروع ہو کر کراچی تک جاتی ہے۔ اس سے آگے اس لئے نہیں جا سکی کیوں کہ بحیرہ ء عرب اس کے راستے میں حائل ہے۔ غیر ذمہ داری عدم واقفیت کا نام نہیں بلکہ وہ حقیقت کو ایسے روپ میں دیکھنے کا نام ہے جو لحہ لحہ بدل رہا ہو۔ یہ زمان و مکان کو ایک ایسی سیال ' متحرک ندی کے روپ میں دیکھنا ہے جس میں آپ دوبارہ کبھی بھی قدم نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے غیر ذمہ دار آدمی ہمیشہ سائنٹیفک بیان بازی سے احتراز کرتا ہے۔

ذمہ داری کے سپاٹ پن کا اس بات سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ذمہ دار لوگوں کے طرز ِ فکر اور طرز ِ عمل کے متعلق آپ آنکھ اور ذہن بند کرکے بھی صحیح پیش گوئی کر سکتے ہیں لیکن غیر ذمہ داری کا ہر دم بدلتا ہوا بو

Scanned with CamScanner

فلموں پکر اتنا غیر یقینی اور اچھوتا ہوتا ہے کہ اس کے متعلق کوئی بیان دنیا انتہائی احمقانہ فعل ہے۔ اردو شاعری میں عاشق اور رقیب دو متضاد رویوں کی علامت ہیں۔ عاشق انتہائی غیر ذمہ دار' ہواکی طرح موج خوشبو کا تعاقب کرنے والا' کبھی وہ محبوب کے کوچے میں جانکلتا ہے کبھی اپنے گھر۔ وہ رات بھر اختر شماری کرتا ہے اور دن بھر بیکاری۔ وہ محبوب کے والد کو دربان سمجھ کر اس کے قدم لے لیتا ہے اور پھر نتائج بھگتتا ہے۔ لیکن وہ سیماب صفت ہر دم مضطرب ہے۔ اسے کسی پہلو چین نہیں آتا' جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتا ہے۔ غرضیکہ اس کی ساری زندگی ضبط و نظم کی مکمل نفی ہے۔ اس کے برعکس رقیب ایک آزمودہ کار سپاہی کی طرح ہر اس مورچے پر موجود ہوتا ہے جہاں احمق عاشق کی موجودگی کا اندیشہ ہو۔ وہ اپنی جنگی چالیں بڑی ذمہ داری سے مرتب کرتا ہے اور پھر انہیں بڑی چابکدستی سے عملی تشکیل دیتا ہے۔ وہ عام طور پر بڑا نیک اور سعادت مند ہوتا ہے۔ اسے عاشق سے کوئی پرخاش نہیں بلکہ اسے تو اس کے نظامِ اخلاق سے اختلاف ہے۔ اس لئے وہ ایک اچھے ذمہ دار شہری کی طرح عاشق کے راستے میں حائل ہو جاتا ہے اور نتیجہ! عاشق بھی کچھ دن دشتِ بخد میں آوارہ خرامی کے بعد اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ یہ دونوں روپ ایک ہی شخصیت کے ذہن میں بر سرِ پیکار ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں غیر ذمہ داری کا شانتی روپ رقیب والے حاسدانہ روپ پر غالب آجاتا ہے۔ پنجابی فلموں میں تو یہ اکثر ہوتا ہے اور ناظرین رقیب رویئے کا حسنِ عقیدت سے سواگت کرتے ہیں وہ احاطہ ء تحریر میں تو نہیں آسکتا۔ لیکن اس سے یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ ہمارے ہاں معقول حضرات ذمہ داری سے حتی الامکان پرہیز کرتے ہیں۔

بحران یا کرائسس میں عام طور پر غیر ذمہ دارانہ رویہ ذمہ دارانہ رویے پر غالب آجاتا ہے۔ وہی لوگ جو عام طور پر آئیڈیل خاوند یا اسی قسم کی شریفانہ مخلوق ہوتے ہیں ' بحران کی صورت میں روز مرہ زندگی کے جامہ احرام

Scanned with CamScanner

سے باہر نکل آتے ہیں۔ وہ خوب ڈٹ کر کھاتے پیتے اور ہنستے کھیلتے ہیں' کیونکہ وہ ہر گزرتے ہوئے لمحے سے اس کی خوشی اور انبساط کا آخری قطرہ تک کشید کر لینا چاہتے ہیں۔ ان کے لیے کل یا اگلا لمحہ ایک بیکار سا مفروضہ بن جاتا ہے۔ ایسے آدمی جو عام حالات میں بیوی کا سامنا کرنا بھی ایک بڑا یادگار معرکہ سمجھتے ہیں۔ بڑی سے بڑی مصیبت کا انتہائی جرأت اور خوش دلی سے استقبال کرتے ہیں۔ مثلاً مجھے ہی دیکھ لیجئے۔ میں کھانے پینے اور سونے جاگنے کے معاملات میں بڑی احتیاط اور پیش بینی سے کام لیتا ہوں ۔ لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ میں میں نے جس بہادری اور بے خوفی کا مظاہرہ کیا وہ ہماری خانگی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش حصہ بن گیا ہے۔ جب شہر پر بمباری کی شدت ہوتی تو میں اس طرح سو جاتا جیسے میں بچپن کی معصومانہ نیند سے ابھی تک بیدار ہی نہیں ہوا۔ ہر کھانا اس شوق سے کھاتا جیسے وہ میری زندگی کا آخری کھانا ہو۔ لیکن میں نے ایسے ہی موقع پر بڑے بڑے ذمہ دار افراد کو دفتر کی میز کے نیچے قیلولہ کرتے دیکھا ہے اور ان کی بے خوفی کا یہ عالم تھا کہ وہ دوسری صبح میز کی بجائے میز کے دراز سے برآمد ہوتے ۔ جب بھی ان سے اس احتیاط کی وجہ پوچھی جاتی تو وہ اکثر یہ جواب دیتے" موت تو برحق ہے اور میں موت سے چنداں نہیں ڈرتا لیکن میں اس طرح خالی ہاتھ مرنا پسند نہیں کرتا۔" خالی ہاتھ مرنے سے انکار دراصل ذمہ داری کا وہ نقطہ ء عروج ہے جس پر ہم اِس وقت قوی حیثیت سے کھڑے ہیں۔ ہم میں کوئی آدمی بھی اس وقت خالی ہاتھ کام کرنے سے انکاری ہے' وجہ معقول ہے۔ ذمہ داری وقت کو Serial time کی اس صورت میں نہیں دیکھتی جب کہ گزرا ہوا لمحہ مرجاتا ہے اور ہر آنے والا لمحہ نزع کے عبوری دور سے گزر رہا ہوتا ہے۔ بلکہ ذمہ داری کے لئے وقت ایک ایسی Duration یا طویل وقفہ ہے جو چلتے چلتے رک گیا ہو اور اس وقفہ میں تمام آنے والے دکھ اور تفکرات ایک غیر متحرک حال کی صورت میں منجمد ہو گئے ہوں۔ ایک ایسا تصورِ حیات جس میں وقت رکا کھڑا ہو آدمی کو خالی ہاتھ مرنے سے روکتا ہے۔ مرنے والا اپنے پیچھے دوکان' مکان'

بینک بیلنس اور ایسے ہی کارناموں کا ایک طویل سلسلہ چھوڑ جانا چاہتا ہے۔ بالکل ایسا ہی جیسے اس سے پہلے اس کا باپ اور مرحوم دادا چھوڑ کر مرا تھا۔ ذمہ داری کا یہ سلسلہ کئی پشتوں تک پھیلا ہوا ہے اور ڈریکولا کی طرح مسلسل ہماری شہ رگ سے خون چوستا رہتا ہے۔ ہمارے ہاں ہر خاندان کا اپنا ایک ڈریکولا ہوتا ہے' جسے عام فہم زبان میں دادا یا پردادا کہا جاتا ہے۔ واللہ! علم بالصواب۔

ہندوستان والوں کو ہمیشہ سکندر اعظم سے یہ شکایت رہی ہے کہ جب وہ مرا تو اس کا ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا۔ یوں تو کفن کے اندر بھی ہاتھ رکھنے کی گنجائش تھی لیکن اہل یونان کا فلسفہ ء حیات کچھ اس طرح تھا کہ وہ خالی ہاتھ کو بھرے ہوئے ہاتھ پر ترجیح دیتے تھے۔ آج بھی مغرب میں خالی ہاتھ شرافت' ایثار نفسی Detachment کی علامت ہے لیکن مشرق میں خالی ہاتھ نکبت' افلاس' غربت اور کمینگی کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے ہمارے ہاں جب بھی کوئی عزیز یا مہمان باہر سے آتا ہے تو ہماری نگاہ غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھوں کا جائزہ لیتی ہے بلکہ زیادہ احتیاط کے طور پر ہم اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی ہتھیلی کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہیں۔ شاید خالی ہاتھ مرنے کا ڈر ہر وقت ذمہ دار افراد کے اعصاب پر سوار ہوتا ہے اور وہ بزدلوں کی طرح لمحہ لمحہ اپنی زنبیل کو غیر ضروری چیزوں سے بھرتے رہتے ہیں۔ چیزوں سے وابستگی لوگوں کی حدِ پرواز کو محدود کر دیتی ہے۔ اس لئے وہ وقت کی غیر معلوم بُعد میں جست لگانے سے گریز کرتے ہیں لیکن غیر ذمہ دار آدمی کے لئے خالی ہاتھ گراں باری حیات سے نجات کی ایک علامت ہے۔ اس لئے وہ ہر چہ باداباد کہہ کر معلوم سے نا معلوم میں جست لگا جاتا ہے' وہ پہلے لمحے کے پرتگال سے نکل کر دوسرے لمحے کے امریکہ میں پہنچ جاتا ہے۔ اس کے اندر کا کولمبس ہر دم جواں رہتا ہے۔ اور ہر وقت نئی دنیا کی دریافت کے لئے اپنے بادبانوں کے رخ موڑتا رہتا ہے۔ دنیا کا تمام بڑا ادب اور سائنسی دریافتوں کا طویل سلسلہ ایسے ہی غیر ذمہ دار افراد کی مسلسل ریاضتوں کا نتیجہ ہے۔ کم از کم میں کسی ایسے بڑے شاعر

کو نہیں جانتا جس کی زندگی مکمل ذمہ داری کی تصویر ہو(دیکھیں علامہ اقبال کی بنیان دھوتی والی تصویر) اگر کسی روز ایسا شاعر پیدا ہوگیا جو صبح سویرے اٹھ کر ہاتھ منہ دھوتا ہے۔ کپڑے پہنتے وقت اپنے اور اپنی بیوی کے کپڑوں میں تمیز کرلیتا ہے اور قرضہ واپس کرنے میں احتیاط برتتا ہے تو یہ دنیائے ادب کے لئے ایک بہت بڑا حادثہ ہوگا۔ بالکل ایسا ہی حادثہ جیسے چنگیز خان کی پیدائش یا نیرو کی موت۔ دراصل چنگیز خان بھی انتہائی ذمہ دار فرد تھا اس کی دقت یہ تھی کہ اسے بد قسمتی سے ایسے غیر ذمہ دار افراد سے واسطہ پڑا تھا جو بیک وقت مسندِ حکومت پر بھی سریر آرا تھے اور ایوان شاعری میں بھی اپنا نام لکھوانا چاہتے تھے۔ نیرو بھی بنیادی طور پر ایک فن کار تھا لیکن اسے سیاسی مصلحت کی بناء پر ایسے کام کرنے پڑے جو ذمہ داری کا تقاضہ کرتے تھے۔ یہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ ہر فنکار خواہ وہ بانسری بجائے یا انشائیہ لکھے بنیادی طور پر غیر ذمہ دار ہوتا ہے بہر صورت میرے نزدیک غیر ذمہ داری ایک ایسا ہی مستحسن فعل ہے جیسا سر کے بل کھڑا ہو کر زندگی کو ایک نئے زاویہ سے دیکھنے کا عمل" کیا آپ اس نیک عمل میں شریک ہونا پسند کریں گے؟"۔

سوال اٹھانا

سوال اٹھانا فطری بات ہے۔ بالکل ایسی ہی جیسے تکلیف اٹھانا یا احسان اٹھانا ۔ چنانچہ جب بچہ غائب سے عالم وجود میں وارد ہوتا ہے تو سب سے پہلے والدین اور دور نزدیک کے رشتہ دار یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اس کا کیا نام رکھا جائے ۔ عام طور پر ایسے خوشگوار موقعہ پر ہی خاندان کے افراد کے درمیان مستقل محاذ آرائی کی بنیاد پڑ جاتی ہے جو آئندہ چل کر قبائلی جنگ کی صورت اختیار کر سکتی ہے ۔نام یوں تو بے کار سی چیز ہے لیکن ننھیال والوں کا خیال ہوتا ہے کہ بچہ کی صورت کیونکہ ان سے واجبی طور پر ملتی جلتی ہے ۔ اس لئے اس کا نام بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے جس سے ننھیال کی بو آسکے ۔ بچے کی ماں کی ہمدردیاں عام طور پر اسی فریق سے ہوتی ہیں۔ ددھیال والوں کا موقف اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور یہ موقف ایک حد تک صحیح بھی ہوتا ہے کیونکہ بچے کا خالق جسے عرف عام میں باپ کہتے ہیں' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہوتا ہے۔ اس لئے عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ بچہ آئندہ چل کر اپنے ددھیال کے کسی قریبی فرد سے مشابہت قائم کرے گا۔ اس لئے انہیں ہی نام تجویز کرنے کا حق ہے ۔ بڑے بوڑھے ایسے موقوں پر اس کا یہ حل کرتے ہیں کہ پچھلے چند سالوں میں میٹرک میں پاس اور فیل ہونے والے طلباء اور طالبات کی فہرست دیکھ لی جائے اور جو نام بھی صوتی طور پر موزوں اور زچہ بچہ سے تھوڑی بہت مناسبت رکھتا ہو' وہی رکھ لیا جائے۔ اس طرح سوال کا عارضی یعنی (Provisional) حل تو ہو جاتا ہے لیکن آگے چل کر بچہ اپنے لئے خود نام تجویز کرتا ہے۔ کبھی قبیلہ کے رکھے

Scanned with CamScanner

ہوئے نام سے بالکل الگ تھلگ ' اور کبھی اسی نام میں ترمیم واضافہ ۔ مثلاً" میرا دوست مستے خان۔ سکندر علی چوہدری بن جاتا ہے اور نذر محمد'ن' م راشد۔

نام میں یہ تبدیلی یا ترمیم محض اتفاقی نہیں ہوتی' بلکہ اس کی نوعیت بنیادی ہوتی ہے ۔ بچہ جب تک اہل خاندان کی جامد اور غیر معقول روایت کا پابند ہوتا ہے۔ وہ اپنے نام کی اسی طرح تکریم وتحفظ کرتا ہے۔ جیسے کچھ پرانے قبائل ٹوٹم کی کرتے ہیں کیونکہ ٹوٹم قبیلہ کے جملہ مفادات کا محافظ ہے ۔ لیکن جونہی بچہ قبیلے کے حصار سے باہر قدم رکھتا ہے تو وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ نام تو محض اتفاقی یا حادثاتی تھا جس کا اس کی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں تو اسے پہلی بار قبائلی جبر کا احساس ہوتا ہے۔ پیدائش کے وقت بچہ انتہائی سیال صورت میں تھا۔ اسے کسی بھی برتن میں ڈالا جا سکتا تھا۔ لیکن جب وہی بچہ مائع کی سیال کیفیت سے ٹھوس اور واضح حقیقت میں بدلنا شروع ہوتا ہے تو رکھاہوا نام محض ایک تجریدی علامت بن جاتا ہے۔ "مُنایا مینا" ایک خاص عمر تک تو بچے کی نامعلوم جہتوں کی نمائندگی کرتے تھے لیکن اب یہ تجریدی نام بچے کے اندر سے اُگی ہوئی شخصیت کا احاطہ نہیں کر سکتا ۔ اب جب بھی میں اپنے بچوں کو ان کے ابتدائی نام سے پکارتا ہوں تو وہ پہلے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہیں اور پھر میرا۔۔ انہیں اپنے موجودہ نام اور بعد از پیدائش نام میں کوئی مماثلت نظر نہیں آتی۔ کیونکہ وہ تو محض ایک سمبل تھا۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ ہر دریافت کا آغاز اور انجام سمبل پر ہوتا ہے۔ اس کی غالباً" وجہ یہ ہے کہ جب تک حقیقت اپنے واشگاف اور واضح روپ میں ہمارے سامنے نہیں آتی تو ہم اس کا رشتہ ایک ایسے نشان یا علامت سے جوڑ دیتے ہیں جو اسی طرح غیر واضح' بے نام اور مجرد ہو۔ مثلاً" ریاضی کے بیشتر کلیے ایک مفروضے پر قائم ہیں " جیسے الف مساوی ب " جب تک آپ اس حقیقت عظمی کو تسلیم نہیں کرتے ۔ آپ آگے نہیں بڑھ سکتے ۔ لیکن ریاضی سے باہر یہ کلیہ صرف غیر منطقی ہی نہیں بلکہ احمقانہ بھی ہے۔ اگر آپ قرضہ الف سے لیں اور واپس ب کو کرآئیں تو آپ کی دیانت پر

Scanned with CamScanner

خیانت اور شرافت پر حماقت کا شبہ ہو گا۔ عائلی زندگی میں ایسا کلیہ تسلیم کر لینے سے بڑے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس لئے خواتین اپنے ناولوں میں ایک جیسے چہرے والی نوجوان لڑکیوں کو مختلف رنگ کے بلاؤزر یا میکسی پہنا دیتی ہیں تاکہ شادی کی بھیڑ بھاڑ میں الف۔ب سے گڈ مڈ نہ ہو جائے۔ دراصل افراد کی تعمیر میں ریاضی کا بہت کم عمل دخل ہوتا ہے۔ اس لئے آپ نے اکثر سنا ہو گا کہ الف کی اپنی ایک الگ بیوی ہے۔ اسی طرح ب کی جداگانہ شخصیت ہے جس کی انفرادیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اس لئے زندہ افراد کی دنیا میں الف اور ب کو جڑواں بھائی بہن کی حیثیت دینا بالکل ایسا ہی جیسے کوئی ماہر حیوانات یہ کہے کہ گھوڑا اور گدھا دونوں برابر ہیں کیونکہ دونوں میں ٹانگوں اور کانوں کا اشتراک پایا جاتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی تجرید کی علامتی سطح سے اوپر اٹھتا ہے تو ایک ایسی شخصیت بن جاتا ہے جس میں بننے اور بگڑنے کی ساری صلاحتیں موجود ہوں۔ یہی خوابیدہ صلاحتیں جب بیدار ہوتی ہیں تو وہ ماں باپ کے رکھے ہوئے نام کے خلاف بغاوت کرتا ہے اور اپنے لئے ایک ایسا نام تجویز کرتا ہے جو اندر کے انسان کی پوری نمائندگی کر سکے۔ چونکہ ن۔م راشد کا اصلی نام تو راشد ہے۔ نذر محمد تو محض ایک ایسی بے کار اور فرسودہ علامت تھی جو شاعر نے بلوغت کے پہلے مرحلہ پر ہی ترک کر دی تھی۔

آپ نے اکثر ہر شاعر کے نام کے ساتھ ایک تخلص بھی دیکھا ہو گا۔ (بالکل ایسے ہی جیسے شادی شدہ خاتون کے ساتھ اس کا بچہ ہوتا ہے) شاعر کا تخلص اس بات کا واضع اظہار ہے کہ وہی فرد جو ابتدا میں ماں باپ یعنی سماج کا غلام تھا' اب خود صاحب اولاد ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ آزاد ہے۔ شعر دراصل اسی آزادی کا میگنا کارٹا ہے اس لئے جب وہ شعر کے انتہائی خوش نما لیکن ناپائیدار میٹریل سے ایک نیا مکان تعمیر کرتا ہے' اور مکان پر نیم پلیٹ لگاتا ہے تو وہ آبائی نام کی نہیں ہوتی بلکہ اس تخلص یا آزاد فرد کی ہوتی ہے جو آباؤ اجداد کی آہنی گرفت سے آزاد ہو کر ایک نئی اور الگ شخصیت بن گیا ہے (سنا ہے لاہور

Scanned with CamScanner

کی ایک نئی بستی سے بیشتر والدین بے نیل مرام لوٹ آتے ہیں کیونکہ ان کا تجویز کردہ نام کسی تختی پر رقم نہیں ہوتا) واللہ اعلم۔ ادب کی دنیا میں شخصی آزادی کا سب سے بڑا مظہر غزل کا مقطع ہوتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعر نے دانستہ طور پر اپنی تخلیق سے اپنے والدین کو خارج کر دیا ہے اور وہ اب اپنی تخلیق کا خود ہی خالق اور خود ہی رازق ہے' لیکن دلچسپ بات یہ ہے۔ کہ جب شعر تخلیق کرنے والا اصلی گوشت پوست (میرا مطلب عام گوشت سے نہیں ہے) کا بچہ تخلیق کرتا ہے تو پھر بیوی کے سامنے یہی سوال اٹھاتا ہے کہ نومولود کا کیا نام رکھا جائے؟

سوال اٹھانا اس لئے ایک دائمی اور بنیادی حقیقت ہے کہ جب تک سوال یعنی چیلنج وجود میں نہ آئے۔ دوسری طرف سے جواب یا Response کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تخلیق کائنات کی ابتداء بھی سوال بلکہ سوالات سے ہی ہوئی تھی جب کہ ملائکہ سے پوچھا گیا کیا تم ان چیزوں کے نام جانتے ہو؟ جواب ظاہر ہے غیر تسلی بخش تھا' ورنہ اس وقت کوئی فرشتہ ہی اس قسم کا انشائیہ لکھ رہا ہوتا۔ ہماری شاعری بھی ایسے ہی سوالات سے بھری پڑی ہے مثلاً "ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے' اور 'یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں' اور کیا ان کے والدین بھی اتنے ہی خوش وضع ہیں"۔ غالب ایسے ہی کئی غیر معقول سوال کرتا ہے۔ اور خوبی یہ ہے کہ اس کے شارحین اتنے ہی غیر معقول جواب دیتے ہیں۔ اس سے غالب کو یہ فائدہ پہنچا ہے کہ لوگ اسے عظیم شاعر سمجھنے لگے ہیں۔ غالب خود بھی اپنے شارحین اور ناقدین کی اس کمزوری سے واقف تھا۔ اس لئے اس نے کہا ہے۔

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

شکر ہے غالب کی دعا مستجاب ہوئی۔

تخلیق کائنات تو خیر بہت دور کی بات ہے۔ اس لئے اس موقعہ پر جو سوال اٹھائے گئے یا اٹھائے جا سکتے تھے وہ مابعد الطبیعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج سے کوئی تین چار ہزار سال قبل جب انسان خاصا مہذب ہو چکا تھا تو

Scanned with CamScanner

اس نے اپنے وجود، اپنے ماحول، اپنے خالق کے متعلق سوال اٹھانے شروع کر دیئے۔ کیوں؟ کیا؟ کیسے؟ اس کی ابجد کے ابتدائی حروف تھے اور اب یہی سوال ان تمام علوم کا ماخذ اور سرچشمہ ہیں جو ہر مکتب اور یونیورسٹی میں پڑھائے جاتے ہیں اور پڑھائے بھی اس خوبصورتی سے جاتے ہیں کہ آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ سوال اور جواب میں منطقی تعلق کون سا ہے۔ البتہ پڑھانے والا جواب کو اتنا پیچیدہ بنا دیتا ہے کہ سوال کا سراغ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔ سنا ہے گوٹروڈ سٹین (Gertrude stein) نے آخری ہچکی سے پہلے پوچھا "جواب کیا ہے؟" لیکن خود ہی اس میں اضافہ کر دیا۔ "لیکن سوال کیا ہے؟" یہ اس کی آخری ہچکی تھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس معمہ کی کشود ممکن نہیں کیونکہ جب سوال کرنے والا حقیقت کے قرب و جوار میں پہنچتا ہے تو وہ ایک ایسے برزخ میں پہنچ جاتا ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔

میں نے اکثر سوچا ہے (ممکن ہے آپ اس سے اتفاق نہ کریں) کہ سوال ایک ایسا عالم برزخ ہے جس کے ایک طرف نہ جاننے کی ذہنی اذیت ہے اور دوسری طرف جاننے کی بے پایاں عقوبت۔ ہم ایک عذاب سے نکل کر جب دوسرے عذاب کی سرحد میں داخل ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نہ جاننے کا عذاب تو اپنے اندر آگہی کی بشارت کی رکھتا تھا لیکن جاننے کا اظہار اس لئے زیادہ تکلیف دہ ہے کہ اس سے اپنی جہالت یا حماقت کا احساس اور گہرا ہو جاتا ہے۔ سنا ہے دریافت کے آخری مرحلہ پر نیوٹن کو یہ احساس ہوا تھا کہ وہ تو محض ایک ایسا بچہ ہے جو علم کے بے پایاں ساحل پر چند سنگریزے اکٹھے کر پایا ہو۔ سقراط کا المیہ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا وہ جب کوئی سوال کرتا تو اس کی انتہائی بد صورت بیوی اس کے سر پر پانی کا بھرا ہوا گھڑا دے مارتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سقراط کا سارا فلسفہ یا طریقہ کار سوالوں پر مشتمل ہے۔ جواب اس لئے نہ دے سکا کہ اسکی موت بیوی کی موت سے پہلے ہی واقع ہو گئی۔

میں نے ابتداء میں ریاضی کے مفروضات کا ذکر کیا تھا۔ میں اس

بات کو ذرا آگے بڑھانا چاہوں گا۔ ریاضی میں سوال تو اس لئے اٹھائے جاتے ہیں کیونکہ اس کے دامن میں سوالوں کے سوا اور کوئی چیز ہی نہیں ۔ ریاضی اور ریاضی دانوں کا سارا کاروبار سوال اٹھانے اور جواب دینے سے وابستہ ہے ۔ البتہ اس سارے عمل میں یہ بات دلچسپ ہے کہ سوال اٹھانے والے کے ذہن میں جواب پہلے ہی موجود ہوتا ہے ۔ مثلاً" جب ریاضی کا استاد آپ سے پوچھتا ہے کہ بتاؤ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں اور آپ سادگی اور شرارت سے پانچ کہہ دیتے ہیں تو وہ بلا توقف بول اٹھتا ہے " چار" اب آپ ہی بتائیں کہ جب وہ جانتا ہے کہ سوال کا مطلوبہ جواب چار ہے تو آپ سے اسے سوال کرنے کا کیا حق تھا؟سوال اس وقت پوچھا جاتا ہے جب ایک سوال کے کئی جواب ہوں یا خود سوال کرنے والے کا ذہن کسی مسئلہ کے متعلق الجھا ہوا ہو۔ مثلاً" اگر آپ بچہ سے یہ سوال کریں "کیا وہ آج سکول گیا تھا؟ " یہ ایک انتہائی اہم اور نازک سوال ہے۔ اس کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں اور دونوں انتہائی پریشان کن ۔ ادب میں بھی یہی خوبی ہے کہ سوال کرنے والے کا ذہن بھی اتنا ہی الجھا ہوا ہوتا ہے جتنا کہ جواب دینے والے کا ' اس لئے سوال اٹھانے والے کو بھی اتنی ہی دقت ہوتی ہے جتنی کہ سوال بٹھانے والے کو ۔ ادب میں سوال دراصل اونٹ کی طرح ہے۔ جس کا اٹھانا اور بٹھانا دونوں مشقت طلب اور حماقت آمیز عمل ہیں ۔ اونٹ اور ادب کو محض سٹارٹ حالت میں ہی دیکھنا چاہیئے۔ مجھے اس امر کا اس وقت شدید احساس ہوا جب میں نے ایک انتہائی موقر ادبی جریدے میں اٹھائے ہوئے سوالات کا مطالعہ کیا۔ سوال کچھ اس نوعیت کے تھے"۔ اردو ادب میں جدیدیت کی لسانی تشکیلات کے مضمرات کیا ہیں؟ اردو ناول میں ارتقائی تنصیبات کی جدلیاتی توجیہات کا پس منظر اور پیش منظر کیا ہے؟ " سوال اٹھانے والا تو سوال میدان جنگ میں چھوڑ کر خود مورچہ میں جا بیٹھا تھا لیکن جواب دینے والے احباب نے سوال کو اس حد تک مختلف سمتوں میں کھینچا تھا کہ خود صاحبِ سوال کا حلیہ ہی بگڑ گیا۔ قطع نظر ذہنی محنتگی کے اس مشق یا کاوش سے اردو ادب

Scanned with CamScanner

کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ کیونکہ سوال و جواب کا عمل تخلیقی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس لئے ادب کے وہ تمام گوشے قاری کے سامنے آجاتے ہیں جواب تک دانستہ یا غیر دانستہ طور پر چھپے بیٹھے تھے۔ سوال کا بنیادی مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ مستور حقائق کو منظور حقائق میں بدل دے۔ پولیس والے بھی تفتیش کے دوران اسی طریقہ کار پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ ابتدائی رپورٹ تو محض چند سادہ سوالوں پر مشتمل ہوتی ہے لیکن دوران تفتیش یہی سادہ اور معصوم کاوش اتنی پیچیدہ اور گرہ دار بن جاتی ہے کہ خود رپورٹ کنندہ ان بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے۔ ادب میں تخلیقی کام کرنے والے اس لحاظ سے پولیس سے زیادہ بد نصیب ہیں کہ وہ ابتدائی رپورٹ یعنی موضوع کا خاکہ بھی خود ہی درج کراتے ہیں اور تفتیش بھی خود ہی کرتے ہیں، بلکہ اپنی تفتیش کی مکمل رپورٹ کی سزا بھی خود ہی بھگتتے ہیں۔

ادب میں سوال اٹھانے کا رواج خاصا پرانا ہے۔ ایک دفعہ چنگیز خان یعنی خان اعظم کے دربار میں ایک شعر پر یہ اعتراض کیا گیا تھا اس میں شتر گربہ کا احتمال پایا جاتا ہے۔ خان اعظم عملی تنقید کے مکتب سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے فوراً" اپنی تیغ آبدار سے شاعر کو دو ٹکڑے کرکے شتر اور گربہ کو الگ الگ کر دیا اور فرمایا" کوئی اور سوال؟" حاضرین بادب با ملاحظہ ہوشیار ہوگئے۔ موجودہ ادبی خلفشار میں بھی ایسی ہی عملی تنقید کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اس نا خوشگوار سوال کو آگے بڑھاؤں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہر عہد کے اپنے کچھ ایسے سوال ہوتے ہیں جو شدومد سے اٹھائے جاتے ہیں چنانچہ یہی سوال اس عہد کا منظر نامہ بھی ہوتے ہیں اور شناختی نشان بھی۔ جتنا کوئی دور سادہ اور سطحی ہوتا ہے اس کے سوالات بھی اسی نسبت سے سادہ اور سریع الفہم ہوتے ہیں، لیکن جب خارج کی دنیا زیادہ تہہ دار اور پیچیدہ ہو جاتی ہے تو سوالوں کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ مثلاً" موجودہ دور کا احمق ترین انسان بھی خدا کی ذات کے متعلق سوال نہیں کرتا کیونکہ وہ حقیقت عظمیٰ کا یا تو مکمل اعتراف کر

چکا ہے یا مکمل انکار ' اس لئے اس سوال کی حکیمانہ اہمیت ختم ہو گئی ہے۔ خود میرے بچپن میں یہ عالم تھا کہ جب مولوی صاحب یوسف زلیخا کا قصہ پڑھ چکتے تھے تو باری تعالی کی ذات پر کچھ دلیلیں دینا ضروری سمجھتے تھے لیکن کل ہی جب میں نے فرصت کے وقت اپنے بچے کو اس بحث میں الجھانا چاہا تو اس نے مجھے فوراً" یہ کہہ کر لاجواب کر دیا کہ اس گھر میں خدا کی ذات اتنی متنازع فیہ نہیں جتنی کہ آپ کی۔ مجھے اس سے اندازہ ہوا کہ ہر دور اپنے سوال اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس وقت کا انسان ان سوالوں سے ہراساں نہیں جو کسی دور میں بہت اہم سمجھے جاتے تھے۔ اب زمین کی گردش کے متعلق کوئی بھی نہیں سوچتا۔ حالانکہ کسی دور میں اچھے بھلے نیک نیت لوگوں نے ایک ستر سالہ بوڑھے کو محض اس بات پر سزائے موت دینے کا ارادہ کیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ زمین ساکن نہیں بلکہ سورج کے گرد گھومتی ہے ۔ موجودہ دور کا سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کتنے ہائیڈروجن بم اس گردش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر سکتے ہیں یہ واقعی اہم سوال ہے آؤ ہم سب مل کر اسے اٹھائیں!

کچھ ریٹائرمنٹ کے بارے میں

یکم جون کو جب میں بستر استراحت سے اٹھا تو میں بالکل مختلف آدمی تھا۔ ایک ہی رات میں میری کایا کلپ ہو گئی تھی۔ جب غسل آفتابی سے فارغ ہو کر میں نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی غیر ارضی مخلوق سے ملاقات کر رہا ہوں۔ چہرے پر نصف صدی کی نوکری کا سارا خلوص اور خاکساری موجود تھی۔ ناک۔ کان اور ہونٹ ایسے سبک لگتے تھے جیسے ان سے کوئی نادیدہ بوجھ از خود ہٹ گیا ہو۔ البتہ چہرے کا وہ تحکمانہ رنگ جو کرسی کی دین تھا غائب تھا۔ حکومت کی جگہ حکمت نے لے لی تھی اور جس چہرہ پر ایک دو دن قبل گراں مائیگی کے نشانات تھے۔ وہاں اب فرد مائیگی کا تاثر غالب تھا۔ بیگم نے پوچھا۔ " آج آپ کالج نہیں گئے۔ طبیعت تو نصیب دشمناں ٹھیک ٹھاک ہے۔" میں نے انتہائی باوقار اور محتاط لہجے میں جواب دیا "بس یوں ہی نہیں گیا پنشن پر آگیا ہوں۔" بیگم نے برہمی کے انداز میں کہا "آپ خود کیوں آگئے ہیں۔" میں خود تھوڑا آیا ہوں " میں نے لجاجت کے انداز میں کہا۔ اس بے ضرر جملہ کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے بیگم اور میرے درمیان ایک ایسی دیوار کھڑی ہو گئی ہے جسے ہم آئندہ آنے والے سالوں میں کبھی بھی پار نہیں کر سکیں گے۔ بیگم نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں بھگوڑا ہوں اور محاذ جنگ پر اپنی بندوق اور راشن کا تھیلا چھوڑ کر گھر کی عافیت میں پناہ لینے آگیا ہوں۔ "Deserter" میرے کانوں میں اپنی پوری شدت کے ساتھ گونجنے لگا۔ میں نے پہلی بار اپنے آپ کو تنقیدی نظر سے دیکھا۔ ریٹائرمنٹ جسے میں آرام اور آسودگی کی علامت سمجھتا تھا وہ خانگی

Scanned with CamScanner

نا آسودگی کی تمہید ثابت ہوئی۔ کہتے ہیں جب سقراط ایتھنز کی اکادمی میں ریٹائرمنٹ کی افادیت اور عظمت پر تقریر کرکے خوش خوش گھر لوٹا اس کی بیوی نے انتہائی برہمی سے کہا۔ "بھگوڑا کہیں کا۔" یہ خانگی کنسٹری سن کر سقراط کا چہرہ لٹک کر پہلے سے بھی زیادہ بد صورت ہو گیا۔

ریٹائر ہونا کوئی ایسا سیاسی یا غیر اخلاقی فعل نہیں جس پر آدمی ندامت یا خجالت محسوس کرے۔ یہ تو بالکل بیماری کی طرح ایک فطری عمل ہے۔ بیماری کے ابتدائی مراحل میں کوئی شریف آدمی اس کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ صحت مند ہے۔ صرف جسم کے چند غیر معقول حصے اپنا فعل پوری ذمہ داری سے سرانجام نہیں دے رہے، لیکن جب ڈاکٹر تفصیلی معائنہ کے بعد مرض کے نام کا اعلان کرتا ہے تو مریض اور اس کے جملہ لواحقین تشویش کے ایک ایسے آہنی دائرے میں محصور ہو جاتے ہیں۔ جس سے باہر نکلنے کے سارے راستے مسدود ہو چکے ہوں۔ مریض پہلی بار تسلیم کرتا ہے کہ مرض اس کی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ وقت پر کھاتا۔ وقت پر سوتا اور میڈیکل الاؤنس کا خاص طور پر خیال رکھتا تو آج ایسی پریشانی کی صورت حال سے دوچار نہ ہوتا۔ لواحقین آغاز مرض میں انتہائی دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ اس ہمدردی میں جھنجلاہٹ کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے اور آخر کار ان سب جذبوں پر [illegible] کا انداز غالب آجاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ دبی دبی زبان سے کہہ رہے ہوں۔ "بیمار تو اپنی حماقت سے ہوا۔ اور مفت میں ہمیں اذیت اور پریشانی میں گرفتار کر دیا۔" قصور بہر صورت کسی کا ہو۔ اب وہ اس آہنی دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ مریض اس لئے گرفتار ہے کیونکہ وہ مرض کا نام جانتا ہے۔ لواحقین اس لئے پابند ہیں کیونکہ رشتہ داری کے اٹوٹ اور جذباتی رشتے سے منسلک ہیں۔ ان کے اندر انتہائی چھوٹا اور خود غرض انسان انہیں مریض سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے، لیکن باہر کا پبلک سلف انہیں مجبور کرتا ہے کہ فی الحال مریض سے وابستہ رہیں، کیونکہ جب تک

وصیت کا مسئلہ بخیرو خوبی طے نہیں پا جاتا مریض سے قربت اور وابستگی انتہائی ضروری ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب تک ڈاکٹر نے مرض کا نام نہیں رکھا تھا اس وقت تک مریض اور اس کے عزیزوں کے تعلقات بالکل نارمل قسم کے تھے، لیکن جونہی مرض کا نام تشخیص کے کاغذ پر منتقل ہوا تو تعلقات کا سارا مزاج ہی بدل گیا۔ "اور خدا نے آدم سے کہا اب تم ان چیزوں کے نام بتاؤ۔" فرشتے سن کر ششدر رہ گئے اور ان کا سارا رویہ ہی بدل گیا۔

ریٹائرمنٹ کے موقعہ پر بھی دوستوں' عزیزوں اور شہروں کے شرفاء کا کچھ ایسا ہی رد عمل ہوتا ہے۔ وہ ریٹائرمنٹ کا نام سنتے ہی قربت اور دوری کی متضاد کیفیات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ انہیں ایک عرصہ پہلے معلوم تھا کہ موت اور پنشن برحق اور ناگزیر ہیں۔ لیکن وہ تو اس دن کے منتظر تھے جب اس واقعہ یا سانحہ کا نام رکھا جائے گا۔ چنانچہ جونہی انہیں معلوم ہوتا ہے کہ نام رکھنے کی رسم پوری ہو گئی ہے اور ریٹائرڈ آدمی کو الوداعی ہار پہنا دیا گیا ہے تو ان کے داخلی محاذ پر ایک آویزش شروع ہو جاتی ہے۔ وہ ظاہری شرافت اور گہری منافقت میں اس طرح تقسیم ہو جاتے ہیں کہ انہیں خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا کون سا سلف اصلی ہے۔ وہ پہلی ہی فرصت میں اپنے دوست یا عزیز کو نوکری کی صلیب سے بخیریت اترنے پر ہدیہ ء تبریک پیش کرتے ہیں اور دوسرے ہی لمحے نہایت والہانہ دردمندی سے اس کو احساس دلاتے ہیں کہ اس ہوش ربا گرانی کے دور میں بیگار بہرصورت بیکاری سے بہتر ہے۔ ان کے انداز گفتگو سے ایسا لگتا ہے جیسے ریٹائرڈ آدمی (میں نے خواتین کا ذکر دانستہ نہیں کیا) اس بھینس کی طرح ہے جس نے دودھ دینا بند کر دیا ہے اور اب وہ اہل خانہ کے لئے ایک ناگوار بوجھ بن گئی ہو۔ آپ پورے خلوص سے انہیں یقین دلاتے ہیں کہ آپ باعزت طور پر نوکری سے فارغ ہوئے ہیں اور آپ کے سامنے مطالعہ ' قومی خدمت اور ادبی تحقیقات کا ایک جامع منصوبہ ہے 'لیکن ان کے ہونٹوں کا زہر خند آپ کو یہ احساس دلا رہا ہوتا ہے کہ باعزت طور پر بری

Scanned with CamScanner

ہونا یا باعزت طور پر نوکری سے فارغ ہونا تو محض سوچ کا ایک زاویہ ہے ورنہ دونوں کا حاصل خانہ خرابی۔

نام رکھنا بظاہر تو لسانیات کا مسئلہ ہے لیکن میرے نزدیک یہ مسئلہ زبان سے زیادہ زندگی کا مسئلہ ہے۔ جب میں ملازم تھا تو احباب مجھے گورنمنٹ سرونٹ کہتے تھے۔ میری بیوی بچے' میرے والدین' لواحقین اور مقربین میرا تعارف کراتے وقت سرونٹ پر اتنا زور دیتے تھے جتنا مغل بادشاہ حرم کی عفت اور پاکیزگی کا ذکر کرتے وقت خواجہ سرا کی شرافت اور عصمت پر زور دیتے تھے۔ حالانکہ سب لوگ جانتے ہیں کہ نوکری' چاکری' ملازمت یا غلامی بذاتہٖ کوئی باعزت پیشے نہیں لیکن یہ دلچسپ بات ہے کہ جب غلامی یا نوکری کے ساتھ مالی مفاد کا تصور وابستہ ہو جاتا ہے تو غلامی ذلت کا نشان نہیں رہتی بلکہ فرد یا خاندان کی عزت کا سمبل بن جاتی ہے (حوالے کے لئے خاندان غلاماں کی تاریخ ملاحظہ فرمائیں) اب جب کہ میں آزاد ہوں تو لوگ میری آزادی اور آوارہ خرامی پر رشک نہیں کرتے بلکہ بیکاری پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔ اب جب کبھی میری بیوی (جو یکم جون سے بیگم کے اعزاز سے محروم ہو کر عام روز مرہ قسم کی بیوی بن گئی ہے) اپنی ہمسائی سے میری پُر وقار ریٹائرمنٹ کا ذکر کرتی ہے تو دونوں طرف چہروں کا عالم دیدنی ہوتا ہے۔ایک طرف طویل' بنجر رفاقت کا دکھ ہوتا ہے اور دوسری طرف تفاخر اور ہمدردی کا ملا جلا احساس! ایسا لگتا ہے جیسے میری ہمسائی کہہ رہی ہو۔"اللہ سلامت رکھے مُنے کے باپ کو وہ ابھی تک نوکر ہے اور تمہارے میاں کی طرح دن بھر گھر بیٹھا سول نافرمانی کے منصوبے نہیں بناتا رہتا" میری بیوی اِس ان کہے جذبے کی زہر ناکی سے واقف ہے اور غالباً" اسے احساس بھی ہے' کیونکہ خواتین چیزوں کی صرف بالائی سطح دیکھتی ہیں۔ جیسے دودھ پر بالائی۔ لیکن میں اپنی جگہ خوش ہوں۔ بالکل رپ وان ونکل کی طرح۔ میں ہمسائی کے خاوند کی طرح اب کسی کا ادنیٰ غلام نہیں اور بقول اقبال اس ارفع مقام پر پہنچ گیا ہوں۔ جہاں ہر صبح خدا مجھ حقیر بندے سے پوچھتا ہے کہ کہو اب

Scanned with CamScanner

کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ میری دقت یہ ہے کہ میں پچھلے کئی سال سے اس سوال کا مناسب جواب نہیں سوچ سکا۔ آپ اسے بیکاری بھی کہہ سکتے ہیں اور کامگاری بھی۔

ریٹائرمنٹ در اصل ایک طویل قید کے بعد آسیب زدہ جیل سے رہا ہونے کی ایک علامت ہے۔ یہ آزادی اور خود مختاری کا ایک واضح سمبل ہے۔ یہ از منہ وسطی کے غلامانہ جبر سے نکل کر جاگیردانہ فراغت اور شرافت کا ایک نشان ہے۔ یہ ایک آزاد روح کو کرسی کی آہنی گرفت سے آزاد کرانے کا منصوبہ ہے ۔ یہ مرکر زندہ ہونے کا اعلامیہ ہے۔ لیکن ریٹائرمنٹ اور پنشن پر آنے کے الفاظ کثرت استعمال سے اتنے فرسودہ اور بد وضع ہو گئے ہیں، کہ جب پنشن کے کاغذات تیار ہونے لگتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے بستہ 'ب' کے کاغذات مرتب ہو رہے ہوں۔ اگر کوئی آدمی متعدی بیماری میں مبتلا ہو تو اس سے قرابت داری یا تعلق کا اظہار کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ریٹائرمنٹ بھی غالباً ایسی ہی متعدی بیماری ہے ۔ مائیں عام طور پر اپنے نوجوان بیٹے اور نو بیاہتا خواتین اپنے خاوند پنشن زدہ حضرات سے چھپا کر رکھتی ہیں۔ وجہ؟ نامعلوم ۔ میرے اچھے اچھے دوست بھی اپنے اچھے اچھے دوستوں سے میرا تعارف کرانے میں ایک ہچکچاہٹ سی محسوس کرتے ہیں۔ ابھی کل ہی ایک بڑے صاحب سے جب میرے دوست نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔" آپ ہیں پروفیسر غلام جیلانی اصغر۔ تمغہ ء امتیاز جو گورنمنٹ کالج میں پرنسپل..... فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی صاحب موصوف والہانہ طور پر معانقہ کے لئے آگے بڑھے۔ لیکن جونہی میرے دوست کے منہ سے یہ نکلا " رہے ہیں" تو معانقہ فوراً مصافحہ میں بدل گیا اور صاحب موصوف کی انگلیاں اتنی بے جان ہو گئیں جیسے میری پنشن ان میں حلول کر گئی ہو۔ غالباً ایسے ہی موقعوں کے لئے شاعر نے کہا ہے۔ دیکھا مجھے تو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ! اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ نام محض Semantics یعنی لسانیت کا مسئلہ نہیں۔ بلکہ یہ تو در اصل زندگی کا مسئلہ ہے۔ جب کوئی

Scanned with CamScanner

نام وُبے 'سے دُتھے' کے منطقے میں داخل ہو جاتا ہے۔ تو تعلقات کے سارے لاحقے اور سابقے بدل جاتے ہیں۔ شاعر کے ہاں ماضی حال میں زندہ ہے کیوں کہ وہ لمحہ گزراں میں رہتا ہے۔ اس کے ہاں دوش و فردا حال کی ہی توسیع ہے۔ اس لئے اگر وہ لوٹ کر دیکھتا ہے تو محض اس لئے کہ ان پرانے دوستوں کا حساب لگا سکے جن سے وہ قرضہ لے کر فارغ ہو چکا ہے اور مستقبل اس لئے اس کے لئے اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ اس کے بطن میں کچھ ایسے امکانات پوشیدہ ہیں جن سے اس کی زندگی کی مفروضہ آسودگی وابستہ ہے' لیکن ریٹائرڈ آدمی تو محض ماضی کی شال میں لپٹا ہوا کمرے کے ایک نیم تاریک کونے میں بیٹھا ہوا ان امکانات کی فہرست مرتب کرتا رہتا ہے جو اس کی گرفت سے نکل کر دوسروں کے ہاتھوں میں چلے گئے ہوں۔

ریٹائرڈ آدمی بالکل شادی شدہ آدمی کی طرح ہوتا ہے جس کے لئے رشتوں کے پیغامات آنے یکسر ختم ہو گئے ہوں۔ جس طرح شادی سے پہلے مرد الزبتھ ٹیلر سے لے کر نور بھری تک کسی خاتون سے شادی کر سکتا ہے۔ اسی طرح ریٹائرمنٹ سے پہلے آدمی امکانات کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہوتا ہے۔ ہر آنے والا دن ایک نئے اور بہتر دن کی تمہید ہوتا ہے۔ لوگ اس سے اس طرح وابستہ ہوتے ہیں جیسے وہ جنم جنم کے ساتھی ہوں۔ اس قسم کی وابستگی میں کسی خود غرضی کاشائبہ نہیں ہوتا بلکہ اس میں تحفظِ ذات کا احساس کار فرما ہوتا ہے۔ جب آپ سیڑھی پر اوپر جا رہے ہوں تو پیچھے آنے والوں کے لئے ایک [illegible] راستہ بنتا جاتا ہے۔ آپ کا ہر اگلا قدم آپ سے نیچے آنے والے کے لیے ترقی اور پیش رفت کا زینہ ہوتا ہے۔ لیکن جب آپ سیڑھی سے لڑھک رہے ہوں' تو پیچھے آنے والے آٹومیٹک طور پر گرتے چلے جاتے ہیں۔ بظاہر تو یہ لگتا ہے کہ ہم میں سے ہر فرد ایک الگ تھلگ جزیرہ ہے۔ لیکن در حقیقت ہم ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں۔ اگر اس زنجیر کی ایک کڑی بھی کمزور پڑ جائے تو وہ سارے سلسلے کی سلامتی کے لئے خطرہ بن جاتی

Scanned with CamScanner

ہے۔ چنانچہ جب ایک فرد جو اس سماجی زنجیر کی ایک کڑی ہے۔ پنشن لے کر پسپائی شروع کرتا ہے تو دوسروں کی رفتار از خود متاثر ہوتی ہے۔ ایسے موقعوں پر آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کی نوکری محض تلاش رزق کا ہی ذریعہ نہیں تھی، بلکہ اس سے ایک غالب فریق (جس میں آپ کے عزیز اور دوست شامل تھے) کی انا کی تسکین بھی وابستہ تھی۔ آپ کی گردن کی غیر محسوس فرازی ان کی گردنوں کو محسوس طور پر بلند کر دیتی۔ جب آپ ہنستے تو وہ سب ہنسنے لگتے۔ آپ کسی نان گزٹیڈ نوکر کو جھاڑ دیتے تو وہ محسوس کرتے جیسے وہ سب مل کر من حیث القوم اسے جھاڑ رہے ہوں۔ غرض کہ وہ آپ کی شخصیت کا ایک لازمی جزو تھے۔ آپ نے ریٹائر ہو کر صرف اپنے بال بچوں سے ہی دھوکہ نہیں کیا بلکہ معاشرے کے ہر اس شریف فرد سے دھوکہ کیا ہے جو آپ سے وابستہ تھا۔ اس لئے وہ کسی شریف آدمی سے آپ کا تعارف کراتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ دراصل ریٹائرڈ آدمی (میرا مطلب مرد سے ہے) اس اغوا شدہ لڑکی کی طرح ہے جو واگذار ہو گئی ہو لیکن اس کا ماضی داغدار ہو گیا ہو۔

رلکے (Rilke ---) نے اپنی ایک نظم میں لکھا ہے کہ موت ہمارے اندر بچے کی طرح اپنے جنم کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ ریٹائرمنٹ بھی در اصل اسی بے نام بچے کی طرح ہے جو ایک طویل عرصہ تک ملازمت پیشہ حضرات کے پیٹ میں پلتی رہتی ہے۔ ان کا خون چوس چوس کر وہ پروان چڑھتی ہے اور جب ایک دن یہ بے نام بچہ منصۂ شہود پر وارد ہوتا ہے تو گھر میں خوشی سے کہرام مچ جاتا ہے۔ ہنستے مسکراتے چہروں پر ملال کی زردی کھنڈ جاتی ہے۔ بڑی بوڑھیاں سر جوڑ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ ہمسائیوں میں کھسر پھسر شروع ہو جاتی ہے۔ شادیانوں کی جگہ تازیانے لے لیتے ہیں اور شہر میں یہ خبر گردش کرنے لگتی ہے کہ نومولود کی ایک ٹانگ سرے سے ہی غائب ہے۔ سر تو ہے تو لیکن اس میں مغز نہیں۔ آنکھ کے حلقے صحیح سلامت ہیں لیکن بینائی ندارد' غرضیکہ بچے کا جنم دن جسے خوشیوں اور مسرتوں کا اعلان ہونا چاہیے تھا۔ اَن سوچے' اَن بوجھے

دکھوں کی نوید بن کر آتا ہے۔ میں نے رنکے کے حوالے سے جب بھی ریٹائرمنٹ کے عمل کا جائزہ لیا ہے تو مجھے لوگوں کا سارا رد عمل بالکل فطری نظر آیا۔ آپ ہی ذرا سوچیں کہ اگر کوئی خاتون ایک طویل عرصہ تک لوگوں کو غیر مبہم ' الفاظ میں یقین دلاتی رہے کہ وہ ایک خوبصورت اور صحت مند بچے کو جنم دینے والی ہے اور لوگ اس یقین دہانی کے پیش نظر اس سے انتہائی خوب صورت توقعات وابستہ کر لیں۔ پھر ایک دن وہ انہیں یک لخت ایک نا مکمل غیر پختہ بچہ پیش کر دے تو لوگوں کے احساسات بلکہ توقعات کو کتنا شدید دھچکا لگے گا؟ ریٹائر منٹ کے بعد بھی کچھ اسی قسم کا واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جب آدمی پنشن لے کر گھر آتا ہے تو ساری خوش آئند توقعات جو اس سے وابستہ تھیں ایک ابنارمل بچے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔

خیال تو یہ تھا کہ جب وہ ریٹائرمنٹ پر آئے گا تو طویل ملازمت کی تھکا دینے والی مشقت کے بعد تحکمانہ عبا اتار کر ڈھیلا ڈھالا لباس زیب تن کرے گا۔ دن بھر بادِ نسیم یا آپا شمیم کی طرح گھر کے صحن میں آوارہ خرامی کرے گا۔ بیوی بچوں سے اس محبت اور ملائمت سے باتیں کرے گا۔ جیسے وہ باہر سے آئے ہوئے معزز مہمان ہوں۔ یاروں دوستوں کی مجلس میں بیٹھ کر چہکے گا۔ انہیں شعر اور لطیفے سنائے گا اور ان کے شعر سنے گا۔ رات لمبی تان کر سوئے گا' اور جب دوسری صبح خوابِ شیریں سے بیدار ہوگا تو اس کے چہرے پر سکون اور شانتی کے نشانات مرتسم ہوں گے۔ غرضیکہ وہ سب کچھ ہوگا جو ایک آئیڈیل خاوند یا مثالی باپ کو ہونا چاہیے۔ لیکن ریٹائرمنٹ کے دوسرے ہی دن توقعات کی یہ فلک بوس عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ ریٹائرڈ آدمی صبح سویرے اٹھتے ہی اپنا سرکاری سلف پرانے کوٹ کی طرح پہن لیتا ہے اور گھر میں گھنٹی کی تلاش شروع کر دیتا ہے تاکہ چپڑاسی کو اپنے وجود کا احساس دلا سکے۔ بیوی بچوں سے صیغہ واحد متکلم کی جگہ جمع غیر متکلم میں گفتگو کرتا ہے۔ وہی بیوی بچے جن سے صرف سرکاری تقریبات میں ملاقات ہوتی تھی۔ اب چاروں طرف پھیلے ہوئے نظر آتے

Scanned with CamScanner

ہیں ۔ فرصت کے وافر اوقات میسر ہیں ۔ اس لئے پہلی بار ہانڈی کی جملہ کمزوریاں بیوی کی نفسیاتی کمزوریاں سمجھ کر دفتری زبان میں سخت نوٹس لیتا ہے۔ دوستوں سے جب ملنے جاتا ہے تو اپنی نشست کو اتنا پھیلا دیتا ہے کہ انہیں یاد دہانی کرانا پڑتی ہے کہ مغرب کی نماز کا وقت جا رہا ہے۔ لوگ اس سے ملنے سے گریز کرتے ہیں ' کیونکہ وہ اپنی ریٹائرمنٹ کی داستان ایسے سناتا ہے جیسے وہ کوئی یونانی المیہ سنا رہا ہو۔ اس طرح نومولود جب لوگوں کی توقعات پر پورا نہیں اترتا انہیں واقعی ایک شدید دھچکا لگتا ہے' ریٹائرمنٹ کا یہ تو سلبی پہلو تھا لیکن اس کا روشن یا ایجابی رخ بھی ہے۔ اس پہلو کی جھلک میرؔ یا اقبالؔ کی شاعری میں ملتی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد میرؔ نے اپنی پنشن یافتگی کی کیفیت کو ایک مقطع میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو ابھی کچھ گنتے گنتے سو گیا ہے

گنتے گنتے سو جانے کی ماورائی کیفیت ایک مخصوص ذہنی رویہ کی علامت ہے۔ یہ محض ریاضی کا مسئلہ نہیں ہے ۔ جوانی میں آدمی اشیاء گنتا ہے یا سوتا ہے۔ نوکری میں بھی یہ شعوری کاوش کارفرما ہوتی ہے لیکن ریٹائرڈ آدمی تو اس آدمی کی طرح ہے جو سیلاب یا طوفان کی رستاخیز سے نکل کر آیا ہو۔ جب تک وہ پانی میں گھرا ہوا تھا تو تحفظِ جان کا مسئلہ سب سے اہم مسئلہ تھا۔ اسے ان بکریوں بھینسوں ' چارپائیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جو سیلاب کی رو میں بہے جا رہی تھیں۔ لیکن جب وہ سیلاب سے نکل کر گوشۂ عافیت میں پہنچ جاتا ہے تو وہ صرف چارپائیوں اور بکریوں کا ہی میزان نہیں لگاتا بلکہ اس رسی کا بھی جو ان کے گلے میں لٹک رہی تھی' اب رسی کی ہر گرہ محبوب کی اس مندری کی طرح یاد آتی ہے جو آدمی نے بے خبری میں کھو دی ہو اور یہ مندری اس کے لاشعور میں جا کر اٹک گئی ہو۔ بُھلانے پر بھی یاد آنے کی یہ روحانی بلکہ ناسٹلجک ۔۔۔ (Nostalgic) کیفیت صرف ریٹائرمنٹ کے قیمتی لمحوں کی دین ہے۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے آدمی گریزاں' برق آسا لمحوں کو روپے پیسے یا نفع نقصان کے زاویے

Scanned with CamScanner

سے دیکھتا ہے لیکن جونہی وہ نوکری کی حراست سے نکل کر آزاد فضا میں داخل ہوتا ہے تو پھر ریزہ ریزہ لمحے وقت کی مکمل اکائی میں بدل جاتے ہیں۔ اب وقت گزرتا نہیں بلکہ منجمد ہو کر ایک نقطہ پر رک جاتا ہے اور چاروں طرف ایک جھٹپٹے کا عالم ہوتا ہے۔ ریٹائرڈ آدمی جاگنے سونے کی ایک برزخی کیفیت میں معلق ہو کر کچھ چیزوں کا میزان کرتا رہتا ہے۔ سطح بیں لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ان نادر لمحوں میں ملنے والی پنشن کے حسابات میں کھویا رہتا ہے۔ میرے نزدیک یہ نکتہ نظر سطحی ہی نہیں بلکہ غیر معقول حد تک سرسری بھی۔ نوکری کے دوران سارا انداز فکر استدلالی یا استخراجی ہوتا ہے۔ چیزوں کو ہم ان کی شیئت ---- (Objects) کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ افسر ہمیشہ افسر اور ماتحت ہمیشہ ماتحت ہی نظر آتا ہے۔ لیکن ریٹائرمنٹ پر آنے کے بعد چیزوں کا کردار یکسر بدل جاتا ہے۔ وہی چیزیں جو واضح اور غیر مبہم تھیں۔ اب مبہم اور غیر واضح ہو جاتی ہیں۔ ان پر ایک مستقل جھٹپٹے کا عالم رہتا ہے۔ چنانچہ اس عالم میں چیزوں کو روپے پیسے میں تحویل کرنا حماقت نظر آتا ہے۔ میں نے حال ہی میں کچھ ریٹائرڈ حضرات سے یہ استفسار کیا کہ انہیں کتنی پنشن ملتی ہے۔ وہ دیر تک حیرت سے میرا منہ دیکھتے رہے جیسے میں نے ان سے کوئی انتہائی ناجائز بات پوچھ لی ہو۔ لیکن خود بھی انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ آج تک انہوں نے ایسا حساب کیوں نہیں لگایا۔ دراصل یہ طبقہ ریاضی کے تنگ تر نظام فکر سے نکل کر ایک ایسے نظام میں داخل ہو گیا ہے جہاں گنتی کا انداز ہی بدل گیا ہے۔ آپ اسے تصوف بھی کہہ سکتے ہیں اور اقبال کا نظریہ ء بیخودی بھی۔ اس عالم میں وہ روزمرہ کی ضروریات سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے۔ غالباً ضروریات بھی اس سے بے نیاز ہو جاتی ہیں۔ 'کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا' وغیرہ وغیرہ۔

آپ نے ایسے ریٹائرڈ آدمی دیکھے ہوں گے جو راشن ڈپو پر صرف آب و دانہ کی تلاش میں نہیں جاتے بلکہ اپنے وقت کاایک گراں قیمت حصہ محض اس لئے گزارنے جاتے ہیں تاکہ رزق پابستہ مخلوق یعنی نوکری پیشہ حضرات

کی حرص و آز کا ڈرامہ دیکھ سکیں ۔ ریٹائرڈ آدمی تو وہ مرد قلندر ہے جو عالم اسباب سے اوپر اٹھ چکا ہے۔ اس کے لئے کھانا پینا' بیوی بچے' دوست احباب سب مایا کا جال ہیں۔ وہ خود وقت کے مرکب پر سوار ایک دفتر سے دوسرے دفتر تک ان کاغذوں کے تعاقب میں ہے جو افقی اور عمودی دونوں سمتوں میں حرکت کر رہے ہیں۔ صرف مرد قلندر کی گرفت میں نہیں آتے۔ یہ کاغذ پنشن کے بھی ہو سکتے ہیں اور عالم بالا میں داخلہ کے بھی۔

میں خود ان دنوں سلوک کی اسی نایاب منزل میں ہوں۔ جب جستجو سے تھک کر انڈرویئر پہن کر سورج کے مقابل برآمدہ میں بیٹھ جاتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر اس قلندر کا گمان ہوتا ہے جس کا گھوڑا گم ہو گیا ہو۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں وقت پر سوار ہوں اور سورج محض میری خوشنودی کی خاطر سوا نیزے پر کھڑا ہے ایک چوبدار کی طرح ۔ ایسے نادر موقعوں پر اندر سے (میرے اندر سے نہیں بلکہ گھر کے اندر سے) آواز آتی ہے ۔ " آج آپ راشن لینے نہیں گئے۔ طبیعت تو نصیب دشمناں ٹھیک ٹھاک ہے " اور میں انتہائی باوقار اور محتاط لہجے میں جواب دیتا ہوں " بس یونہی نہیں گیا۔ میں پنشن پر ہوں " اور وہ دیوار جو میں نے یکم جون کو استوار کی تھی ۔ اب اور بلند ہو گئی ہے۔ میں اور بیگم اپنی اپنی جانب سے اسے ہر صبح چاٹنا شروع کر دیتے ہیں لیکن شام تک یہ اور سنگین ہو جاتی ہے۔ غالباً میری ریٹائرمنٹ نے اس دیوار کو دیوارِ آہن بنا دیا ہے۔

بستر میں لیٹنا

بستر میں لیٹنے کے کئی فائدے ہیں۔ مثلاً لیٹنا۔ لیٹ جانا اور لیٹے رہنا۔ میں نے یہ بات محض جذبات کی رو روی یا غیر سنجیدہ انداز میں نہیں کہی بلکہ حسب توفیق بڑے غور و فکر کے بعد کہی ہے۔ یونانی فلاسفہ اور بالخصوص ریا ضی دان بستر کی اہمیت کے خاصے معترف تھے۔ کہتے ہیں جب ایک دفعہ جالینوس یا شائبد اوقیانوس کسی بہت ہی نازک مسئلہ کی زد میں آیا تو وہ عالم سرشاری میں اپنی خواب گاہ کی طرف دوڑا۔ (بد قسمتی سے اس زمانہ میں باتھ روم کا رواج نہیں تھا) اس کے اشتیاق اور وارفتگی کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ جب اس نے دیوار کی سکائی لائن کے ساتھ اپنا براق بستر دیکھا وہ چلا اٹھا۔" پالیا ' پالیا" بعد کے سو فسطائی فلاسفہ نے اس نعرہ مستانہ کی غلط توجیہات کر کے اس کے سارے حسن کو غارت کر دیا اور شاید یونانی سلطنت اور فکر کا زوال بھی اسی دن سے شروع ہوا جب کہ حقیقت پر تجریدیت غالب آگئی۔ خیر یہ مسئلہ آپ اہل یونان پر چھوڑ دیں۔ موجودہ دنیا کے بیشتر مسائل (خاندانی منصوبہ بندی سے قطع نظر) کچھ اس قدر الجھ گئے ہیں کہ ان کا حل صرف بستر میں لیٹنا ہے۔ اگر آج دنیا کے اکابر سیاستدان' جو امن کی بقا کے لئے انسانیت کو جنگ کی آگ میں جھونک رہے ہیں 'اپنی امن پسندانہ مساعی کو چھوڑ کر بستر میں لیٹ جائیں تو ان کا سارا انداز فکر ہی بدل جائے۔ دراصل انسان کا طبعی نظام بڑا دلچسپ ہے۔ اگر وہ سیدھا کھڑا ہو کر سوچے تو اعصاب میں تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ جسم کی ساری طنابیں سارنگی کی تاروں کی طرح کھچ جاتی ہیں اور بعض امن پسند غدود بھی جنگ

Scanned with CamScanner

پر آمادہ نظر آتے ہیں لیکن اگر وہی آدمی زیرِ شکم ہاتھ باندھ کر ناک کی سیدھ میں دیکھنا شروع کر دے تو عرفانِ ذات کا ایسا مرحلہ آتا ہے جب کہ سارا عمل اور بالخصوص جارحانہ عمل مہمل نظر آنے لگتا ہے۔ مہاتما بدھ محض ہاتھ باندھنے کے عمل کے لئے ایک سمبل نہیں بلکہ وہ تو شانتی اور خود شناسی کا ایک مظہر ہے۔ ہاتھ باندھنے کا عمل کوشش اور ریاضت کا مطالبہ کرتا ہے جو یقیناً بدھ کی تعلیم کے خلاف ہے۔ سکون کا اصلی مرحلہ وہ ہے جب آدمی لیٹ جاتا ہے اور کئی چھوٹے چھوٹے طوفان اوپر سے گزرنے لگتے ہیں۔ مدافعت خواہ بیٹھ کر کی جائے یا کھڑے ہو کر اس سے جارحیت اور داخلی ہیجان کا پہلو نکلتا ہے۔ یونانی حکماء انسانی جسم کی اس کمزوری سے خوب واقف تھے اس لئے وہ لیٹ کر سوچتے اور حتی الامکان لیٹ کر ہی عمل بھی کرتے۔ ہم تک ارسطو اور افلاطون کی درسگاہوں کی جو تصویریں پہنچی ہیں ان میں سکون کا عنصر غالب ہے۔ استاد اور شاگرد لیٹے ہوئے ہیں اور عالمِ بالا کے بارے میں نقطہ آرائی کر رہے ہیں۔ لمبے لمبے آن سلے چوغے۔ فراخ سینے اور ڈی لکس داڑھیاں ان کی داخلی طمانیت کی مظہر ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک ایسا مثالی ماحول پیدا نہ ہو آدمی یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ یہ تمام کائنات اور اس کے تمام کل پرزے عالمِ اعیان کا عکس ہیں۔ آپ کہیں گے کہ اگر افلاطون کا فکری انداز اتنا ہی صحت مند ہے تو اقبال نے اس سے مصالحت کیوں نہ کی؟ دراصل اس کی اہم ترین وجہ یہ تھی کہ اقبال سرے سے مصالحت کا قائل ہی نہیں تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ اقبال کے نزدیک افلاطوں بستری آسودگی کا ایک غیر اسلامی سمبل تھا۔ اقبال کے خیال میں تو زندگی پیرِ تسمہ پا کی طرح بے چارے آدمی کے شانوں پر سوار ہے اور اسے شب و روز بھاگ دوڑ پر اکسا رہی ہے۔ جب آدمی تھک کر رک جاتا ہے اور پیر تسمہ پا سے پوچھتا ہے کہ "میاں آخر اس بے سود بھاگ دوڑ کا حاصل کیا ہے؟" تو وہ اسے "کوششِ بیہودہ بہ از خفتگی" کہہ کر ایک اور مہمیز لگاتا ہے اور آدمی بغیر سوچے سمجھے دوڑنے لگتا ہے۔ آپ میں سے اکثر لکھے پڑھے لوگوں نے کلامِ اقبال

Scanned with CamScanner

میں اس قبیل کے سینکڑوں شعر پڑھے ہوں گے۔

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

یہ شعر فنی لحاظ سے خوب ہے لیکن اگر آپ اس پر عمل پیرا ہو کر محلے کی گلیوں میں گردشِ پیہم کا عملی مظاہرہ شروع کر دیں تو نتائج کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔ اقبال بھی تو صرف مسلسل عمل کا راستہ دیکھاتا ہے اور حتی الامکان نتائج کی ذمہ داری سے گریز کرتا ہے۔ میں خود بھی عمر کے اس مرحلے میں داخل ہو چکا ہوں جہاں آدمی دوسروں کے نجی معاملات میں دخل دینے کو معیوب سمجھتا ہے۔ جو تیری رضا ہو تو کر۔

اگر آپ آسودگی' امن اور ذہنی بالیدگی کو تہذیب کا کمال سمجھتے ہیں تو آپ کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر بڑی تہذیب کا نقطہ عروج بستر ہے۔ جب انسان کوئی نئی دریافت کر کے گھر لوٹتا ہے اور بستر کی آغوش میں لیٹ کر اپنے بچوں کو فرضی اور غیر فرضی کارناموں کی دلچسپ داستانیں سناتا ہے تو افسانہ' ناول اور رپورتاژ قسم کا تخلیقی ادب جنم لیتا ہے۔ آپ میں سے جن بھلکے ہوؤں نے مارکوپولو یا ابن بطوطہ کا سفر نامہ پڑا ہے وہ اب تک میری فراست اور ذہنی دیانتداری کے قائل ہو چکے ہوں گے ۔ مارکوپولو سے اب تک یہ روایت چلی آتی ہے کہ سردیوں کی رات میں جب کوئی دلچسپ داستان آرائشِ محفل بننے لگتی ہے تو سامعین اپنے بستروں میں گھس جاتے ہیں اور پھر انہماک کا وہ مرحلہ آتا ہے جب داستان گو اور سامعین کے جھوٹ میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

کسی کتاب میں آدم و حوا کے متعلق بڑا تفصیلی بیان میری نظر سے گزرا لیکن بستر کی بات ذرا استعارے میں چھپ گئی ہے۔ جنت چھوڑنے کے یوں تو کئی معقول اسباب ہو سکتے ہیں لیکن سبزہ ء نورستہ کا سیم زدہ بستر اور جنت کی خنکی ایک ایسی جائز شکایت ہے جس پر نوبیاہتا جوڑے کا برہم ہو جانا چنداں تعجب خیز نہیں ۔ زوالِ آدم کے فوراً" بعد نیل اور فرات کی وادی میں وسیع پیمانے پر کپاس بوئی گئی تاکہ آدم زمین کی سخت جانی سے گھبرا کر راہیِ ملک جنت

نہ ہو جائے ۔ روم نے بستر کی وسعت اور آرام میں اضافہ کیا ۔ یہ اسی منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا کہ روم کے مستند اور سکہ بند قیصر بستر میں بیٹھ کر شعر سنتے۔ چھوٹی موٹی جنگیں لڑتے اور اس کے بعد چین کی بانسری بجاتے تھے ۔ اسی ریاضت کے طفیل ایک دن روم جل بھُن کر دنیا کا مرکز بن گیا۔ یہ اسی بستری فلسفہ کا کارنامہ تھا کہ مارکس اریلیس صبح منہ نہار دو چار صحت مند غلاموں اور بھوکے شیروں کا مناظرہ سنتا اور شام بستر میں بیٹھ کر رواقی فلسفہ پر سر دھنتا۔ اقبال یوں تو بنیان پہن کر کم و بیش نصف صدی بستر میں لیٹا رہا لیکن وہ ذہنی طور پر ہمیشہ اٹن شن نظر آیا۔ شاید اسی وجہ سے اقبال کے ذہین ناقدین کا خیال ہے کہ اس کا فلسفہ حرکی ہے۔ ضرور ہوگا کیوں کہ عام طور پر اردو ناقدین جھوٹ کم ہی بولتے ہیں۔

بعض لوگ بستر اور بیکاری کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔ مثلاً" آپ کسی روز یونہی اپنے دفتر کے کسی بھلے مانس سے پوچھیں" صاحب آپ فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں" تو وہ نہایت معصومیت سے کہہ دیں گے" یونہی لیٹا رہتا ہوں" اس سے زیادہ احمقانہ جواب میں نے آج تک تنقید میں بھی نہیں پڑھا۔ یونہی لیٹنا اور بستر میں لیٹنا بنیادی طور پر دو مختلف عمل ہیں ۔ یونہی لیٹنے سے بے کاری، بے زاری اور اپنے افسر اور دفتر سے شدید نفرت کا تاثر پیدا ہوتا ہے لیکن بستر میں لیٹنا تو ایک سوچا سمجھا فعل ہے ۔ جب آدمی غیر شاعرانہ قسم کے بوٹ اور کپڑے اتار کر شب خوابی کی زرہ بکتر پہن کر بستر میں داخل ہوتا ہے تو زندگی کا سب سے مصروف پروگرام شروع ہوتا ہے۔ بستر تو دراصل ایک میدان عمل ہے۔ ایک کار گاہ فکر، جس میں نئے نئے تخلیقی منصوبے عالم وجود میں آتے ہیں۔ بستر میں آدمی بے کار لیٹ ہی نہیں سکتا ۔ بے کاری تو ایک ذہنی کیفیت ہے اور یہ صرف اسی صورت ممکن ہے ۔ جب آدمی ڈاکٹر سے ساز باز کر کے سرکاری طور پر بیمار پڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ صرف ملت اور وطن ہی کے دشمن نہیں بلکہ بستر کی شرافت سے بھی غلط فائدہ اٹھاتے ہیں ورنہ مخلص قسم کے انسان تو بستر

Scanned with CamScanner

میں لیٹنے سے پہلے اپنی نیتوں کا جائزہ لے لیتے ہیں۔ مجھے ہی دیکھئے ' میں پچھلے کئی سالوں سے بستر بند ہوں (یہ ترکیب میری ذہنی اور فکری وابستگی کو ظاہر کرتی ہے) اور میں نے بقائمی ہوش وحواس بستر میں وہ تمام کام کیے ہیں جو میری نسل کے لوگ سر انجام دے رہے ہیں۔ بستر کا دائرہ عمل اتنا وسیع ہے کہ اس حدود میں رہ کر ہر کام بخیر و خوبی تکمیل پزیر ہو سکتا ہے۔ ایٹم بم بنانے' آم کھانے۔ روٹی پکانے یا اسی قسم کے چند غیر اہم کاموں سے قطع نظر جن کا ذکر کرنا مناسب نہیں ۔ باقی سارے کام بستر میں با آسانی ہو سکتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ جو کام بستر میں نہیں ہو سکتا اس کا نہ ہی کرنا بہتر ہے ۔ میں دنیا کا ہر کام بستر میں کر سکتا ہوں' مثلاً" سو سکتا ہوں۔ لیٹ کر کھانا کھا سکتا ہوں۔ بیوی بچوں کو سرزنش کے انداز میں عمل کی تلقین کر سکتا ہوں ۔ جدید اردو شاعری پڑھ سکتا ہوں ۔ رضائی کا خیمہ بنا کر لارنس آف عربیا کی معیت میں صحرائے عرب کی سیر کر سکتا ہوں ' بلکہ اگر موسم خوشگوار اور میری صحت واجبی طور پر اچھی ہو تو سند باد جہازی کے ساتھ بالغ سیمرغ پر سوار ہو کر کبھی کبھی اس رومان پرور وادی میں بھی جا سکتا ہوں جہاں کوہ ندا سے آواز آتی ہے۔" ایک بار لیٹا ہوں دوبارہ لیٹنے کی ہوس ہے۔"

ممکن ہے آپ میرے دلائل سے متاثر ہو کر فوراً" بستر پر دراز ہو جائیں اور میری ساری محنت اکارت جائے۔ میں اپ کو لیٹنے سے منع نہیں کرتا۔ لیکن لیٹنے سے پہلے آپ کو ایک مخصوص زاویہ ء نگاہ پیدا کرنا ہوگا۔ دراصل لیٹنا اتنا ضروری نہیں جتنا کہ لیٹنے والا اندازِ فکر پیدا کرنا ' یہ فکر بھگتی تحریک کی طرح محض شاعری نہیں بلکہ ایک مثبت فلسفہ حیات ہے۔ جب تک آپ اس کے حصول کے لئے ریاض اور پیہم محنت نہیں کریں گے' آپ کا بھی وہی حشر ہو گا جو اس شاعر کا ہوا جس نے کہا تھا" لیٹ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے۔"

Scanned with CamScanner